"دستور"

رشید ترابی

ایک ایسے وقت اس کتاب کی ترتیب میں مصروف ہوں جب کہ اپنی جاتی ہوئی دنیا سے سوا تجربہ و اعتبار کے کچھ مانگ نہ سکا۔ تجربوں کے ایک مرقع کو سجانے کی کوشش کی ہے جس کا ہر نقش مناسب واردات پر کسی نہ کسی کے لئے اثر آفرین ہوگا۔ کالائے درویش کی بساط ہی کیا جو صلہ و ستائش طلب کرے یا اُس کی کوئی قیمت ٹھیرائی جائے یہی بہت ہے کہ مفکر انسان اس کا مطالعہ کریں۔ اس پیمانہ میں اکثر تلخیاں ہیں جن کی طرف زیادہ تر اُسی وقت رغبت ہوگی جب شیرینیاں مرض بن جائیں اور میٹھا زہر معلوم ہو یہ متفرق افکار تہدیہ چاہتے ہیں اور یہ ہدیہ ہیں۔

لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ

اس قوم کے لئے جو مُفکر ہو

رشید ترابی

متوقع ٹھوکر

سچ کہا ہے کہ لذتیں الگ الگ ہیں اور ہر انسان کا معیارِ لذت جدا ہے مگر جب کوئی شاعر درد کے حد سے گذر جانے کو لذت سمجھے اور کوئی فلسفی ترکِ لذت کو لذت جانے تو میں سوچنے لگتا ہوں کہ عوام کے روز و شب سے یہ کتنے دور ہیں اور عملی زندگی سے کس قدر بے پروا۔

بھوک اور پیاس میں پیٹ بھر کھانا اور جی بھر پانی وہ لذت ہے جس کے حصول کے لئے کائنات کا ہر ذی حیات بے چین ہے۔ یہ کھانا اور پانی نہ ملے تو پھر ترکِ لذت میں بغاوت ہے اور ایسا درد اگر حد سے گذر جائے تو موت۔ پھر شاید ہی موت دوا بن جائے۔

جن اللہ کے بندوں کے پاس افراط سے کھانا اور پانی ہو وہ نہ تو افراط سے کھا سکتے ہیں اور نہ افراط سے پی سکتے ہیں۔ وہی پیٹ کی آگ جب بھڑکے تو اُس کو بجھانے کے لئے گنے ہوئے نوالے اور نپے ہوئے گھونٹ حلق سے اُتارے جاتے ہیں۔ اور اُس وقت ایسوں کو

بھی اس لذت کی گرانقدری معلوم ہوتی ہے کہ حقیقت میں پیٹ بھر غذا کیا چیز ہے!

پھر اس زمین پر کروروں انسانوں کی بھوک محشر نہ مچائے تو پھر کیا ہو؟ اب اس بھوکے انسان کے آگئے فلسفہ اور منطق۔ مابعد الطبیعات اور تصوّف۔ مذہب اور اخلاق وہ سراب ہیں جہاں پہونچ کر پیاسا اور پیاسا ہو جاتا ہے۔

جھوٹی تسلیّوں سے بھوکا انسان نہیں بہلایا جاسکتا وہ پیٹ پر ہات مارتے ہوئے کائنات کو ٹھکرا دینا چاہتا ہے۔ اب اُس کی بلا سے اس ٹھوکر کی زد پر کوئی آئے۔ سیاست و حکومت کے دلدادہ۔ دین و مذہب کے علمبردار اب ذرا ہشیار ہو جائیں۔ اگر اس مسئلہ کا حل نہ نکلا تو یہ سب اُس کی ٹھوکر پر!

کتنا آسان ہے یہ تصوّر کہ اب انسان اتنا مادّی ہو گیا ہے کہ اس کو سوا روٹی کے کچھ نہیں سوجھتا۔ مگر اس طرح سوچنے والے کی خانگی زندگی پر صرف ایک نظر رازِ درونِ خانہ کو فاش کر دیگی اور پھر معلوم ہو جائیگا کہ روح کا سکون جسم کے سکون پر منحصر ہے۔ اور مکان ڈھا کر مکین کو آرام سے نہیں رکھا جاسکتا۔

سیاست

علم ایسا کہ عالمگیر مرض اور جو علم بھی ہے اور فن بھی۔

فن ایسا کہ ہمہ گیر پریشانی۔ جس کے جاننے کا سب کو بجا طور پر دعویٰ

اور جس پریشانی میں ہر شخص بصد خوشی مبتلا ہے۔

حاکم و محکوم کا درمیانی تعلق روحِ سیاست ہے جس سے کسی کو

مفر نہیں۔ مشاہدہ تجربہ اور تاریخ اس کے عناصر ہیں اور معاشرہ

کی نمو پذیری اور تغیر پسندی کی وجہ ہر آن ترقی و تبدل کے امکانات

سے یہ دوچار ہے۔

وہ علم جو زیادہ سے زیادہ عمل پہ منطبق ہونے کی کوشش کرتا ہے

اور چونکہ طبعی تغیرات اور جغرافی ماحول کی تبدیلی سے مشاہدے تجربے

اور تاریخ میں تغیر لازم ہے اس لئے ہر جگہ اس علم کے اُصول یکساں نہیں

رہ سکتے پھر ہر مقام کی سیاست یکساں کیسے رہے؟

دنیا کسی نظام حکومت کی پابند ہو اقتدار چند ہاتھوں میں رہتا

ہے۔ اُصول حکومت جب بدلتے ہیں تو یہی اقتدار دوسرے چند

ہاتھوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔ عوام کا ہر فرد کسی صورت بھی مقتدر

نہیں رہتا۔

مقتدر انسانوں کی بے راہ روی کو محکوم اپنی پریشانیوں کا باعث سمجھتا ہے اور ان کی تبدیلی چاہتا ہے اور ذی اقتدار طبقہ کے پاس سیاست سے عبارت "عوام میں ہیبت و خوف پیدا کرنا" ہے۔ اور اسی میں وہ اپنی بقا سمجھتے ہیں۔

ساری دنیا میں آج کمزور کی سیاست خوشامد اور طاقتور کی سیاست مکاری ہے۔ جہاں ضعیف اور قوی کا معاہدہ ایک کی خود فریبی اور دوسرے کی حیلہ سازی ہے۔

ایسی ہی سیاست میں کیا ہوا وعدہ کل کی بات ہے جو گذر چکا۔ ظاہر ہے کہ وقت جا کر پھر نہیں آتا اور وقت کیساتھ معاہدہ بھی۔ اور اگر یہ معاہدہ باقی بھی رہے تو اس کی ترمیمات اور تبدیلیاں فقیر کی گدڑی کے وہ پیوند ہیں جو اصل کپڑے کی جگہ لے لیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں کون وفساد میں قوی کی سیاست کے سامنے صالح کی سیاست کا کوئی مقام نہیں کیونکہ اس دنیا کی زبان میں اس کو سیاست ہی نہیں کہتے۔

طاقتور کے اقتدار کا تصور ہی سیاست کے لیے ایک محور ہے۔ بظاہر کتنی تسلی ہے کہ کسی ملک کے اندرونی معاملات میں بیرونی قوتوں کا اقتدار و خیل نہیں۔ مگر کمزور ممالک کا نظم و نسق انکی تجارت و صنعت

پر ہمیشہ بیرونی قوتوں کا اثر رہتا ہے۔ ملک کے معادن زمین کی دولتیں اگرچہ داخلی خزانے ہیں لیکن ملک کمزور ہو تو اس پر باہر کے سانپ مسلط ہو جاتے ہیں۔ یعنی قوی کا اقتدار وہ دماغ بن جاتا ہے جس کے ہر اشارہ پر جسم کے سارے اعضاء و جوارح حرکت کریں۔

اگر سیاست قانون فطرت کے ہم آہنگ ہو جائے۔ اور "دوسرون کے ساتھ انسان ویسا ہی سلوک کرے جیسا وہ چاہتا ہے کہ دوسرے اس کے ساتھ کریں تو فتنہ وہ فساد کا بڑی حد تک خاتمہ ہو جائے گا۔ اور سیاسی نقطۂ نظر سے انفرادی آزادی اور ملکیت کا حق یعنے فطری زندگی کی دونو خصوصیتین محفوظ رہینگی"

اگر سیاست سے مقصود حکمران اور محکوم طبقات کے درمیانی فصل کو مٹانے کی کوشش ہو اور اگر سیاست سے عبارت حکومت کا ایک حالت سے بہتر حالت میں منتقل ہونا اور اگر سیاست کا نتیجہ بیرونی طاقتوں سے مل جل کر اپنی طاقت کو باقی رکھنا ہو اور اس طرح ہر آن قوی تر بننا مقصود ہو تو ایسا علم مبارک ہے اور ایسی سیاسیات سے بیزاری گناہ۔

اصلاح یا انقلاب؟

"سیاسی غور و فکر کا مرکز ریاست ہے جس کے آغاز پر گفتگو خطرناک ہے" جہاں نظم و نسق کے قائم رکھنے کے لئے حکومت کا کوئی دستور جاری ہو مگر چونکہ فطرت انسانی تغیر پسند ہے اس لئے طرز حکومت میں ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

شخصی حکومت ہوں یا جمہوریت آمریت ہو کہ اور کوئی نظام حکومت اصل میں عدل و داد کی وہ کوشش ہے جہاں حقوق کی حفاظت اور اجتماعی زندگی کی ہر جہتی ترقی ایک اہم مقصد بن جاتی ہے۔

ہر ایک نظام حکومت اپنے نظام توازن کو کھو کر بدنام ہوتا ہے۔ اور جب حقیقی معنی میں اعتدال باقی نہیں رہتا تو متاثر ذہنیتیں انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہیں اور اکثر ایسے انقلابات افراط و تفریط کی طرف جاکر بظاہر نجات کے راستے ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن چند دنوں میں پھر عدل و داد کے فقدان پر دنیا کسی نئے نظام کے لئے بے چین ہو جاتی ہے۔

مجذوب نیٹشے نے یہ کیوں کہا تھا کہ "حکومت ہر نیکی اور برائی کی زبانوں میں مشہور ہوتی ہے اور وہ جو کچھ بھی کہے وہ جھوٹ ہی ہوتا ہے اور جو کچھ بھی اس کی ملکیت ہے وہ چوری کا مال ہے۔ حکومت میں اس کو

کہتا ہوں جہاں تمام لوگ زہر خور ہوں خواہ اچھے ہوں یا بُرے حکومت وہ ہے جہاں تمام لوگ اپنے آپ کو کھو بیٹھتے ہوں خواہ اچھے ہوں یا بُرے۔ حکومت وہ ہے جہاں سب لوگوں کے سسک سسک کے خودکُشی کرنے کا نام زندگی رکھا گیا ہے۔"

یہ صرف اس لئے کہا گیا کہ اس کے پیش نگاہ جو حکومتیں تھیں اُن میں توازن نہ تھا یعنی حاکم و محکوم میں محبت و احترام کے جذبے نہ تھے۔ نتیجتاً بغاوت کیش طبیعتیں انسانی ذہن کو مسموم کرنے کی فکر میں مشغول ہوگئیں اور بجائے اسکے کہ اعتدال و توازن کی تبلیغ کیجاتی اور انسان مصلح بنتا وہ باغی بن گیا۔

سیاسی انسان اصلاح و انقلاب میں فرق کرتا ہے۔ خصوصاً جب یہ محسوس و معلوم ہو کہ انسانیت خود متغیر ہے اور کبھی ایک حال پر راضی نہیں۔ حکومتیں اور اُنکی ساری سیاست اگر بہرے پن پر اتر آئے اور کچھ نہ سُنے اور سب کچھ کہے تو پھر انقلاب غیر متوقع نہیں۔ لیکن سُننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہو۔ اعتدال و توازن کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اور اپنے ہوس کی قربان گاہ پر غریب رعایا کی بھینٹ نہ چڑھائے اور اپنی سیاست کو اخلاق کا ہم آہنگ بنادے تو ایسی حکومت مبارک ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ ایسی ہی حکومت میں بتدریج اصلاح ریاست کی نمو پذیری پر دلیل ہے۔ اور ایسے موقع پر انقلاب کی ہر کوشش بے عقلی اور خودکُشی کے مترادف ہوگی۔

ماضی کا فلسفہ مستقبل کی عقل سلیم ہے اور گذشتہ کا تجربہ آیندہ منازل کے لیۓ نشان راہ۔ ہر ایجاد و اختراع ہر انکشاف و تعمیر میں بار بار اگر بنیادی تبدیلیاں کی جائیں اور ماضی پر بھروسہ کر کے کام ہمیشہ ابجد سے شروع کیا جائے۔ تو ترقی کی کوئی صورت نہ رہیگی۔ بالکل اسی طرح ریاست کی نشو و نما کے لئے ماضی سے مستقبل کا ربط باقی رکھتے ہوئے اصلاح کے مساعی زیادہ کامیاب ہونگے اور انقلاب کی ہر تحریک چونکہ گذشتہ سے آیندہ کو منقطع کردیتی ہے اسلئے مضرت رساں ثابت ہوگی۔

وقت کے پیشوا

کرسیوں پر آجانے کے بعد۔

نشۂ حکومت میں چور، وہ مستبد دیوتا جو عام رعایا سے ہر آن پرستش چاہتے ہیں۔ جن کے دامن عوام کے دسترس سے باہر۔ جن کے گھر عوام کی پہونچ سے دور۔ اور جن کے لئے یہی دنیا جنّت ہے۔

دیکھتے اور سمجھتے سب کچھ ہیں مگر اپنی بقا کے خیال سے چپ ہیں۔ رعایا کی طرف سے یا راعی کی طرف سے جب ایکبار اُن کا انتخاب ہو جاتا ہے تو پھر یہ منتخب کرنے والوں کا کم خیال کرتے ہیں۔

اُن کی ضرورت سے زیادہ تنخواہیں عوام کی قلیل آمدنیوں سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتیں تو اِسی تناسب سے رعایا کے ساتھ اِن کا سلوک بھی ہوتا ہے۔ اور پھر ہر چیز کا سرکاری ہونا ان کے عز و افتخار میں اُس ہیبت و سطوت کو بھی شامل کر دیتا ہے جس سے عوام میں حق بینی و حق گوئی کے جذبات بُری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ احتجاب عن الخلق کی وہ کبریائی شان جس کا یہ اکثر مظاہرہ کرتے ہیں رعایا کو آخر کار بھڑکا دیتی ہے۔ اور کبھی کبھی یہی بُت جو پتھر سے زیادہ جامد رہتے ہیں پجاریوں ہی کے ہات سے چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

اچھی حکومت کا راز یہی ہے کہ اجتماعی زندگی کے اصلاحی تدابیر کے ساتھ ساتھ

حکمران ومحکوم میں کھانے پہننے اور رہنے سہنے کے طریقوں میں کوئی امتیاز نہ رہی۔
یہ مسلّم ہے کہ ہر ریاست اور اسٹیٹ کے لئے اس جماعت کا وجود لازم
ہے۔ خوش قسمت ہے وہ ریاست جس کے حکّام عدل وعفو، صداقت وایثار کے
مجسمے ہوں۔ ان ہی کی اچھائی پر حکومت اچھی اور ان کے کبر ونخوت تمرد واستبداد
سے حکومت بُری ہوجاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب حکومت کے پاس معیارِ تکریم وبزرگی دولت رہے
تو وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ایک مستبد اور جابر نظامِ حکومت میں ہونا چاہئے۔ مگر جہاں
تکرمت وافتخار کا معیار دولت نہو۔ علم ہو صداقت ہو عمل ہو۔ وہاں نہ حکومت
کی طرف سے استبداد ہوتا ہے اور نہ عوام کی طرف سے احتجاج۔

حکمران طبقہ کے پاس بزرگی کی قدروں کو بدل جانا چاہیئے۔ کاش سونا
چاندی اور جواہر کی پستی سے نگاہیں ہٹ کر اخلاق کی بلندی پر مرتکز ہوجائیں۔
یہ ہے اُس حکومت کی شان جو بے گناہی سے قریب تر ہوتی ہے۔

ایسی دنیا میں جہاں حکومتوں کی نگاہ میں دولت نہ ہو عمل ہو وہاں
عموماً مرکزی حکومت بہت زیادہ افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ جن کو روپیہ اور تونگری
اُس مقام پر نہیں پہونچاتی بلکہ اُنکی صداقت خیر بینی اور خیر کوشی اس مقام کا
اُن کو مستحق قرار دیتی ہے اور اسی لئے وہ معاوضہ میں ضرورت سے زیادہ
معیار مبادلہ نہیں مانگتے۔

ان کی ضرورتیں کم سے کم ہوتی ہیں اور زندگی نہایت سادہ وہ کسی کے زیر اثر نہیں ہوتے اور اس طرح جب مرکز کے سارے افراد اپنے کردار کے خود نگران ہوں تو سارے ملک میں چھوٹے سے چھوٹے عہدیدار بھی انتہائی محتاط ہو جاتے ہیں۔

مرکز کی بے راہ روی ملک بھر کی بے راہ روی ہے۔ یعنی ملک کے افراد کا دیانت سے ہٹ جانا مرکز کی بد دیانتی ہے۔

وقت آگیا ہے کہ تائید سے بڑھکر یہ تنقید کو پسند کریں۔ کیونکہ یہ خود بھی کسی کی تائید نہیں کرتے۔ نقد و نظر سے جب غلطیاں منظر عام پر آتی ہیں تو غلطی کو محسوس کرنے کے باوجود اُن پر صرف اس لئے اصرار کرنا کہ احساس برتری کو ٹھیس لگتی ہے انتہائی نا عاقبت اندیشی ہے۔ جس سے صرف انکی ذات ہی نہیں بلکہ ریاست کی ہمہ گیری متاثر ہو جاتی ہے۔

پھیلتی ہوئی بے اعتمادی چھائی ہوئی ناامیدی ناقابل ذکر افلاس اور عام جہالت یہ سب جنگ کے وہ میدان ہیں جو پانی پت اور واٹر لو کے میدانوں سے زیادہ خوفناک ہیں۔ اور جن پر فتح پانے کے لئے نسبتاً زیادہ جرات ہمت اور استقلال کی ضرورت ہے۔ آج حکومت کے تدبر و فراست کا امتحان ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کس حد تک کامیاب و کامران رہیگی!

اخلاق

شاید اپنے زمانے کے حالات کے پیش نظر میکیاولی نے یہ کہا تھا کہ "حکمرانوں کو بستر کے نیچے اخلاق کی کتابیں رکھ کر سوجانا چاہیئے" لیکن حکمران طبقہ اگر اس نصیحت پر آج بھی چلے تو اُن کو اپنا بستر لپیٹ رکھنا پڑیگا۔

اخلاق کو سیاست سے الگ کرنا فرد کی شخصیت میں انتشار پیدا کرتا ہے۔ جس سے آخر میں مجموعۂ افراد غیر مُنظّم اور غیر مربوط ہو جاتا ہے۔

آج دنیا میں اخلاق کا تصور اضافی ہے۔ اور تمدن کے ساتھ ساتھ اس کے تصورات بدلتے جاتے ہیں۔ عبادت گاہوں کی قدیم رسمیں۔ قربانی کے پرانے رواج۔ ایذائے ذات کے مہلک اور متعدی طریقے کبھی اخلاق کے اعلیٰ اُصول تھے مگر آج متمدن نسلوں نے اُن اُصول کو بہیمیت اور بربریت قرار دیا ہے۔

اسی طرح یہ کہا جاتا ہے کہ قوانین حکومت کی بنیادیں اُصولِ اخلاق پر رکھی جاتی ہیں لیکن وہی اُصول جو مصلحتوں پر مبنی ہیں اور غیر مُعین ہیں کس کو خبر ہے کہ کل دنیا ان ہی قوانین کو ناقص قرار دے اور اُن کی بنیادوں کو بد اخلاقی پر محمول کرے۔

اخلاقی قدروں کی بنیاد اُصولِ فرائض انسانی پر رکھی جاتی ہے

اور اجتماعی زندگی میں انسان اُصولِ فرائض کی ادائی کے لئے حکومت کا جبر چاہتا ہے۔ حکومتیں اس جبر کو انصاف سمجھتی ہیں اور اُصول فرائض انسانی حکومت کے منشاء و مفاد پر متعین ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ "ایک مکمل نظام حکومت کے پاس اُصولاً اخلاقی اور سیاسی حیات میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا"۔ لیکن خود حکومتوں کے عمل میں فرق پیدا ہو جاتا ہے اور اگر ایسا فرق پیدا ہو جائے تو" اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ عمل معیار پر پورا نہیں اُترتا"۔ درس اخلاق سیاسی تخیل کے لئے ایک رہبر ہے۔ انسان کا حق آزادی ہے اور آزادی کی اخلاقی قدر یہی ہے کہ اُس کی آزادی دوسرے انسانوں کی آزادی میں خلل انداز نہ ہو۔ اور انسان اس اخلاقی فرض کو بغیر کسی جبر کے ادا نہیں کر سکتا اور عموماً یہ جبر ریاست اور سیاسی معاشرے کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہر اس سیاسی معاشرے یا ریاست میں جہاں اخلاق صرف طاقتور کے مفاد کا نام ہو اکثر اصول اخلاق کا تعین حکومت کے طریقۂ عمل پر منحصر رہتا ہے۔

اگرچہ مفکرین عالم کے پاس اعلیٰ اصول اخلاق میں اختلاف نہیں لیکن حکومتوں کے اخلاق تقریباً سب کے سب اضافی ہیں جن کو کسی اور محاورہ سے یاد کرنا ہو گا۔

عموماً اُس انسانی آزادی کو معیار اخلاق سمجھا جاتا ہے جہاں لاکھوں انسانوں کے انتشار کو حکومت اپنا مفاد سمجھے لیکن ذی شعور انسانوں کی

فکر و عقل سے استفادہ نہ کیا جائے جہاں چند سری حکومت اپنے بقاء واستحکام کے لئے ہر اس قانون کی تعمیل کو اخلاق سمجھے جو دوسرے کسی نظام حکومت میں ظلم واستبداد کے ہم پلہ قرار پائے۔

آزادی کے صحیح معنیٰ یہ ہیں کہ "انسان کے تمام ذہنی اخلاقی اور روحانی قویٰ کا نشو ونما ہو" اور وہ معراج کمال کو پہونچے۔ انسانوں کو ایسی آزادی کی طرف مائل کرنا حکومتوں کا واحد فرض رہا ہے۔ اور حکومتوں کی ایسی ہی کوشش انسانوں میں اخلاقی احساس کو قوی سے قوی تر کرتی جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر حکومت انسان کو خود مختار چھوڑ دے تو سیاسی واخلاقی زندگی کا ہر بلند مقصد ختم ہو جائیگا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ انسان جبراً کسی مادی نظام کا پابند کر دیا جائے تو پھر بھی اس کا نیک ہونا لازم نہیں۔ فطرت انسانی کے غائر مطالعہ کے بعد درمیانی راہ کو ڈھونڈنا جذبات کے دھارے کو اعلیٰ مقاصد کی طرف موڑ دینا۔ اور رہنمائی کے عنوان بدل کر نیتوں پر قابو پانا ایک منظم اجتماعی زندگی کا اعلیٰ ترین نصب العین ہے۔ لیکن کسی حکومت کا کیا حال ہو جہاں فلسفۂ اخلاق عملی زندگی پر منطبق نہیں۔ جہاں اخلاق کو زندگی کے ہر شعبہ پر محیط نہیں سمجھا جاتا ہے۔ جہاں خانگی اور سرکاری زندگی کے اخلاق میں فرق ہو۔

افراد حکومت کا کاروبار حکومت میں انہماک یقیناً ضروری ہے۔

لیکن مظلوم درخواست گذاروں سے گریز و احتراز کے لئے کثرت کار کا عذر اور وقت کی کمی کا بہانہ اُصول اخلاق کو قوانین حکومت سے جُدا کر لینے کے مترادف ہے۔

افراد حکومت کی طرف سے دیانت داری اور راستبازی کا بار بار اظہار ہوتا ہے لیکن عوام حق رسی سے محروم ہیں۔ سفارشوں سے مرعوب نہ ہونے کا اعلان ہے لیکن کمزور اور قوی کی سفارش میں فرق ہوتا ہے اور اسی طرح کی بہت سی بے اعتدالیوں کا یہ نتیجہ ہے کہ انکے ابروؤں کے بل اور پیشانیوں کی شکنیں ملک کے عام اضطراب کی ذمہ دار ہوتی جارہی ہیں۔ نظام حکومت میں تبدیلی کا بار بار نعرہ ان ہی کی ٹیڑھی نگاہوں اور بدزبانیوں کا مرہون منت بن رہا ہے۔

رائے عامہ کی طاقت ذرا بھی کمزور پڑے تو یہ امراض اور متعدی ہو جائیں گے۔

آزاد شعلے

ہر ذی حیات اپنی اپنی زبان میں کچھ نہ کچھ بولتا ہے اِسی طرح انسان بھی مگر یہ بھی نہایت معقول بات ہے کہ انسان کے سوا کوئی ذی حیات "بیہودہ بکواس" نہیں کرتا۔ وہ گندگی اور زہر جو ایک انا کی نمائش میں بے موقع تقریر سے پھیلایا جائے انتہائی مہلک ہوتا ہے۔ بے وقت کی باتیں وہ شعلے ہیں جس سے بولنے والا اپنا اور اپنی قوم کا خرمنِ حیات پھونک دیتا ہے۔ جہاں آتش فرو انجنوں کے پہونچتے پہونچتے سب کچھ جل جاتا ہے۔

قوموں کی تاریخ یہ بتلاتی ہے کہ اکثر چند بے محل سخت جملوں نے خاندان اور قبیلے سے گزر کر پوری قوم کو مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ عدالت کے اکثر مقدمے اور جنگ کے بیشتر میدان زبان کے بے موقعہ استعمال کے نتائج ہیں۔

عموماً تقریریں عوام کی پسند کی جاتی ہیں اور یہ سوچ کر کہ سُننے والے کیا سُننا چاہتے ہیں وہی انداز تقریر اختیار کیا جاتا ہے جہاں لفظوں کا غلط استعمال جذبات کی رو میں خود لفظوں کی طاقتیں کھو دیتا ہے۔ مجمع موجیں لیتے ہوئے دریا کی طرح کسی سے ٹکرانا چاہتا ہے مگر جب وہ

منتشر ہوتا ہے اور افراد تنہا ہو کر اپنے اپنے گھر لوٹتے ہیں تو بھڑکائے جانے کے باوجود طبیعتوں کی دبی ہوئی آگ نہیں بھڑکتی فقط اس لئے کہ تقریر مجمع کے لئے ہوتی ہے فرد کے لئے نہیں ہوتی۔

فرد کی خانگی زندگی اس کی گھریلو کشمکش اور روزمرّہ کے جھگڑے جو ممکن ہے کہ کسی بولنے والے نگاہوں میں ہوں۔ مگر اس کے الفاظ ان سب پر اثر انداز نہ ہوسکیں تو پھر ساری خطابت کی قوتیں فرد کی اصلاح سے عاجز ہو جاتی ہیں۔

انقلابات کی ذمہ دار اکثر خطابت ہی رہی ہے۔ مگر دوربین حکمت افراد کی مسلسل تربیت سے وہ دور رس نتائج پیدا کر لیتی ہے جو مجمع کے وقتی اور فوری اہتزاز سے کہیں زیادہ موثر ہے۔

مقرر ملک و قوم کے لئے بظاہر اپنے زورِ بیان سے حیات کی بہاریں دکھلاتا ہے۔ مگر اکثر بولنے والے کا طوفانِ ہوس قومی بہاروں کے لئے صرصر بن جاتا ہے۔ ذاتی مخالفتیں، ہٹ دھرمی، اپنی بات کی پچ، نفسیات مجمع کا تتبع یہ وہ چند اُمور ہیں جو مقرر کے وقتی جوش اور مجمع کے آنی ہیجان میں دوامی تباہیوں کا باعث بنتے ہیں۔ وہ زبان جس کو عقل کے تابع رہنا چاہیئے اکثر عقل کو اپنا تابع بنا لیتی ہے۔

حکومتیں جن کی یاد ہمیشہ تازہ ہوتی ہے اور جن کا حافظہ فکر انتقام میں

کبھی کمزور نہیں پڑتا جو اپنے وقار و عظمت کے بقا کے تصور میں کسی تنقید کو اچھی ہو یا بُری برداشت نہیں کر سکتیں۔ اپنی مستبد طاقتوں سے ہر آواز کو کچل دیتی ہیں یہاں اچھے بھی مارے جاتے ہیں اور بُرے بھی۔ اچھوں کی موت قربانی ہے مگر بُرے اپنی تباہی میں قوم کو بھی لپیٹ لیتے ہیں۔

زبان کی قوتوں کا اندازہ جن کو ہے وہ جانتے ہیں کہ اگر یہ خود غرض نہو اور لفظوں کا صحیح استعمال جائے تو آزادیٔ تقریر کے مطالبہ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ کیا قیامت ہے کہ وہ زبان جو بولنے والے کے ادنیٰ ارادہ کی پابند ہو غیروں سے اظہار مدعا کی بھیگ مانگے اور عجیب بات اس دور کی یہ ہو کہ آزادیٔ تقریر کا مطالبہ عمومیت اختیار کرے اور حکومتوں کی "ایک نہیں" اس طلب کو اصرار اور ہٹ میں بدل دے۔ قید خانے بھر جائیں اور انسان کا احترام ہورا ئیگاں جائے۔

بولنے والے کے لئے مناسب الفاظ کا وقت پر استعمال اور حکومتوں کے لئے وقت کا احساس اور مناسب تعاون وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

عدل

جس کا غلط مفہوم خود ایک ظلم ہے۔

کس نے کہدیا کہ مدارج کی یکسانیت کو عدل کہتے ہیں۔ کوئی شئے بے محل ہو جائے تو اُس شئے کا مقصد مفقود ہو جائیگا۔ عدل یہی ہے کہ ہر ایک کو حسب صلاحیت حصہ ملے۔ نہ یہاں اکثریت کے مطالبات سے خائف رہنے کی ضرورت ہے اور نہ اقلیت کی اصابت رائے سے بے اعتنائی برتی جاسکتی ہے۔ اِس پھیلی ہوئی کائنات میں ذرہ سے آفتاب تک ہر شئے کا ایک وزن ہے اور اُس وزن کی ایک قدر۔ لیکن یہ وزن جسم کا نہیں افادیت کا ہے اور قدر اُسی قیمت پر منحصر ہے۔ افراد میں افادیت کی کمی وبیشی پر قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اور ان ہی قدروں کے اعتبار سے اُن کا موزوں صلہ عدل ہے۔ حق بینی و حق شناسی کے ساتھ ساتھ حق رسی بھی لازمی ہے۔ اور اگر یہ نہیں تو ظلم ہے۔ ایک مختصر سا سوال بند حالات پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ کیا واقعی حق پہچانا جاتا ہے؟

کیا حق کو پہچان کر حق رسی کی کوشش کی جاتی ہے؟

کیا خدمتوں کے لئے واقعی صلاحیتیں ڈھونڈی جاتی ہیں؟

کیا حکومت کے با اقتدار افراد اپنے عزیزوں کی موجودگی میں دوسروں کو حکومت کے قابل سمجھتے ہیں؟

کیا اکثر ایسا نہیں ہوتا کہ دوسرے کم درجہ افراد کی صلاحیتوں اور ان کے دماغی کاوشوں کو مقتدر حکام اپنے مساعی کا نتیجہ بتلاتے ہیں؟

کیا صرف عدلیہ کے لئے عدل ہے عاملہ کے لئے عدل نہیں؟

کیا عدل و انصاف کی بارگاہیں صرف غریب و متوسط طبقات ہی کے لئے ہیں؟

کیا افراد حکومت کے ہاتھوں کیا ہوا ظلم بھی کسی عدالت میں انصاف کو پہونچتا ہے؟

کیا واقعی سزا مناسبت جرم پر دیجاتی ہے؟

کیا یہی رحم ہے کہ سزا میں تخفیف کی جائے؟

کیا عدل کا نام لیکر جرم کی حوصلہ افزائی نہیں کی جا رہی ہے؟

کیا یہی عدل ہے جس سے عاجز ہو کر دنیا ایک نئے نظام کو ڈھونڈے۔

کیا یہ طریقے نہیں بدلے جا سکتے ہیں؟

فریبِ امن

قومین اپنی جبلت اکتساب کی وجہ لڑ پڑتی ہیں اور نوامیس قدرت

پر جب تھوڑا سا قابو انسانوں کو حاصل ہو جاتا ہے تو سائنس کی

ترقی کے ساتھ ساتھ جنگ کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیا جاتا ہے۔

لڑائی کے خاتمہ پر صلح کے خواب دیکھے جاتے ہیں جس کی تعبیر پھر عالمگیر

جنگ کی شکل اختیار کرتی ہے۔ کیونکہ صُلح خود ایک حالت جنگ ہے۔

جب تک امن کا کوئی ذمہ دار نہ ہو۔ اس دور ونکرار سے عاجز ہوتا

ہوا انسان ایک ایسے حل کا متلاشی رہتا ہے جہاں حقیقت میں ایک

طویل عرصہ کے لئے جنگ کو روک رکھنے کے تدابیر پر غور کیا جاتا ہے۔

کیا واقعی یہ ممکن ہے کہ ابن آدمؑ سفک دماء اور فساد فی الارض سے

دور ہو جائے۔ اگر نوع بشر پر راز مَالاَ تعلمُون آشکار کر دیا جائے تو

شاید کوئی صورت نجات کی نکل آئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فتنہ کو قتال سے دفع کیا جاتا ہے لیکن

جب خود قتال فتنہ بن جائے تو پھر لڑائی کے رُکنے کا امکان باقی نہیں

رہتا۔

الہامی درس جس کو قدیم و کہنہ سمجھا گیا وہ تو یہی تھا کہ جنگ کے بعد

فاتح میں احساس برتری اور مفتوح میں احساس کمتری نہ ہو۔ اولاد آدم کو خواہ وہ کہیں ہوں ایک سمجھا جائے۔ معیار بزرگی دولت نہ ہو بلکہ ایک ہنر گار زندگی جس کو تقویٰ کہتے ہیں معیار بزرگی قرار پائے۔

ہزار کروٹیں بدلنے کے بعد آج دنیا کے سارے مفکر مختلف منشورات کے ذریعہ اور مختلف آزادیوں کے اعلان کے بعد یہ ضروری سمجھنے لگے ہیں کہ نوع انسانی سے نسل و رنگ کے امتیاز کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اس قابل نہیں کہ وہ دوسری قوم کو اپنے نظریات کا غلام بنائے اور نہ کوئی قوم دوسری قوم کے مفادات کی امین بن سکتی ہے۔

خدا کی پہلی الہامی تعلیم یہی تھی کہ کائنات کی ساری چیزوں میں نفسِ انسانی کو سب سے زیادہ محترم سمجھا جائے۔ مگر جب نسل و رنگ کے امتیاز پر ایک قوم نے دوسری قوم کو محکوم رکھنے اور اپنی سلطنت کی وسعت کے لئے دوسری قوموں کی زرخیز زمینوں کو اپنا بنانے کی کوشش کی تو یہ احترام جاتا رہا اور انسان کا لہو بے حقیقت قرار پایا۔ عام خونریزی اور عالمگیر لڑائیاں رونما ہوئیں۔ اس طرح انسان محترم نہیں بلکہ طاقت رکھنے والی قوم محترم قرار پائی اور بقائے اقویٰ کا قانون نافذ

ہو گیا۔

انسان کی آزادی اور مساوات کا پرچار کرنے والے ہمیشہ عالمگیر لڑائیوں سے تھک کر خود اپنی بقا کے لئے کمزور قوموں کی آزادی کا اعلان کرتے ہیں یہ اندازِ عفت بیچارگی کے سبب ہے۔ انسان کا احترام منظور نہیں کیونکہ ابھی ان پر انسان کی "وحدتِ خلق وبعث" کا راز آشکار نہیں۔

مابعد جنگ زمانے میں تعمیر نو کے لئے منصوبہ بندیاں ساری دنیا میں عام ہیں۔ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ جو جنگ نظریات کے اختلاف کی وجہ سے ہوئی ہو اس کو نظریات کا عالمگیر اتحاد ہی ختم کر سکتا ہے جس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ فاتح قوموں نے یہ تو واضح کیا کہ چار آزادیاں یعنی اظہار مطلب کی آزادی، مذہب کی آزادی، خوف سے آزادی، اور احتیاج سے آزادی عالمگیر امن کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن فکرِ انسانی نے اس کا اندازہ نہیں کیا کہ سب کی آزادیاں مستقبل میں پھر سب کی قید کا دیباچہ ہیں جن کا نام لے کر جنس خام کے لئے دنیا کے بازاروں پر قبضہ ہوگا۔ کلیسا کے سفیر پھر فوجوں کے علمبردار بنیں گے۔ بڑھتی ہوئی آبادیوں کے لئے نئی زمینوں پر قبضہ ہوگا بے جا انتفاع واحتکار کے ذریعہ نادار اور مفلس انسانوں کو غلام بننا پڑے گا سائنس کی تخریبی جدوجہد کمزور قوموں کے لئے ایک مستقل خطرہ رہے گی۔ ان سب اُمور کی موجودگی میں امن عام کو باقی رکھنے کی کوشش ایک

سعیٔ غیر مشکور سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی۔

آج دنیا جن اصولوں کو کہنہ و قدیم سمجھتی ہے اور مذہب سے منسوب کر کے ان کی اہمیت کو گھٹانا چاہتی ہے شاید پھر وہی اُصول دنیا کو امن کا مژدہ دے سکتے ہیں وہ یہی اُصول تھے کہ نسل و رنگ کا امتیاز مٹایا جائے۔ مشرق و مغرب کے انسانوں میں تنہا مساوات نہیں اخوت کو قائم کیا جائے۔ صرف امداد باہمی کے اُصول پر نہیں بلکہ بِرّ و تقویٰ پر تعاون کو لازم قرار دیا جائے۔ کسی قوم کی دشمنی کے باوجود عدل سے عدول نہ کیا جائے اور پھر سب سے آخر میں اور سب سے اہم اس وحدتِ فکر کو پیدا کیا جائے جو ایک واحد حقیقی کے سامنے ہمیشہ ذمہ دار رہے اور انسان دیس کی بندگی کو نہیں بلکہ خالق عالم کی بندگی کو اپنا منصب حیات قرار دے۔

بہرحال دو ہی صورتیں رہ جاتی ہیں یا دُنیا مذکور الصدر اصولوں پہ عمل کرے اور یا پھر امن کے صرف زبانی دعووں سے ایک اور جنگ کیلئے مہلت حاصل کرے۔

صبر آزما منزل

دنیا کی سب سے بڑی حقیقت اور سب سے بڑی سچائی جس کو دلائل سے ثابت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی وہ دنیا کے گوناگوں مصائب ہیں جن کو سمجھانا اور اُن کے وجود پہ فلسفہ و منطق سے روشنی ڈالنا کسی مفکر کا کام نہیں رہا۔ زندگی عام ہے اور زندگی کے ساتھ درد بھی عام۔ مسرت آنی و فانی ہے اور مصیبت باقی و دائم۔ انسانوں کی اکثریت اس زحمت و تکلیف میں مبتلا ہے جس کا اظہار ناممکن ہے۔

بیماریوں سے فریش ہزاروں انسان۔ فاقوں کی تکلیف سے جاں بلب لاکھوں آدمی تن ڈھانکنے کی استطاعت نہ رکھنے والے کروروں بندے اسی سرزمین پر رہتے اور تڑپ تڑپ کر اسی زمین کے اندر پناہ لیتے ہیں۔

ماں باپ کے لئے سب سے زیادہ محبوب شئے انکے بچے ہیں۔ جن کا فاقوں میں بلبلانا سردی میں اکڑنا دھوپ میں تلملا اُٹھنا بیماریوں میں سِسکنا اور پھر اُن سب پر ماں باپ کی مجبوری وہ قیامت خیز مناظر ہیں جو شب و روز ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ گھر کی بربادی، شوہر کی موت، یتیم بچوں کی دربدری۔ دنیا کی نعمتوں کو دیکھ کر ان کا ترسنا

اور محروم رہنا یہ سب کچھ وہ حقائق ہیں جن سے انکار کی مجال نہیں صحت و بیماری کی دونوں صورتوں میں غریب انسانوں کا صبح سے شام تک محنت کرنا اور پھر بچوں کو پیٹ بھر روٹی نہ دے سکنا کچھ کم مایوس کُن نہیں۔ اور پھر اس مزدور کا ضعیف و مفلوج ہو کر نا اُمید ہو جانا اور پیٹ بھرے انسانوں کی طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھنا افسانہ نہیں حقیقت ہے۔

کیا یہ سب اسی لئے ہے کہ قدرت نے ان کو متمول اور تونگر گھرانوں میں نہیں پیدا کیا؟ کیا یہی صورت حال باقی رہتی اگر اُن کے پاس بھی وسائل دولت فراہم ہوتے؟ پھر دنیا کیوں گھبرا اُٹھتی ہے۔ جب یہ پریشان روزگار انسان احتجاج کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ جب ان مصیبت زدوں کو اس کا یقین ہے کہ سب آدم کی اولاد ہیں مگر مراعات اخوت سے محروم ہیں۔

ذی استطاعت خاندانوں پر بھی ایک وحشت کا دور گذرا ہوگا لیکن وہ مُقدر سے ہو یا اُن کے دماغ کی کاوش کا نتیجہ مکاری و فریب دہی کی وجہ سے ہو یا فطرت فیاض کا عطیہ بہر حال وہ آج دولتمند اور یہ پریشان حال ہیں۔

محلوں کے مقابل ان کے خستہ حال جھونپڑے، عیش و تنعم کے مقابل اُن کی فاقہ کشی، تیز رفتار سواریوں کے مقابل ان کے تھکے ہوئے پاؤں اور

پھر کس مپرسی کے عالم میں ان کی موت، یہ خاموش طعنے، یہ پرسکوت بد دعائیں سامانِ قہر بنتی جا رہی ہیں جس سے اہلِ دولت کی نیند اڑ چکی ہے۔ لیکن اپنے کو حق بجانب سمجھتے ہوئے وہ بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ یہ سب کھیل قدرت کے ہیں جس میں صلاحیتیں نہ دیکھیں دولتِ دنیا سے محروم کر دیا اور حرفِ ظرف کسی کو دولتِ دنیا سے مالا مال کر دیا۔ کیسی اچھی تسلّی اور بے حس زندگی بسر کرنے کے لئے کیسا اچھا استدلال۔

لیکن واقعی دولتمندوں کی خطا کیا ہے؟ جاگیردار طبقہ نے کیا غلطی کی ہے؟ ایک نے دماغی کاوشوں سے روپیہ حاصل کیا دوسرے نے آبائی دولت ورثہ میں پائی۔ ان کا دولتمند ہونا یا دولتمند رہنا ان کی کیا غلطی ہے؟ کیوں وہ موردِ الزام و طعن ہیں؟ اِس لئے کہ روپیہ اُن کے پاس ہے یا اس لئے کہ روپیہ کا مصرف درست نہیں۔ اگر دنیا اِس بات پر اُن کو مطعون کر رہی ہے کہ وہ صاحبِ ثروت ہیں تو یہ فکر کی غلطی اور نفس کا فریب ہے۔ خود مُفلس رہ کر تونگر کو بُرا کہنا حسد ہے اور اگر دولت کے غلط مصرف پر اعتراض ہے تو وہ انسان جو واقعی معدن کے سانپ ہیں اور خزانۂ دولت کے دربان اِس طعن و تنقید کے یقینی مستوجب ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اُن کو مصرفِ زر کے اُصول بتلانا چاہیئے اور ان کی کوتاہ بینی سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔ کسی کی ملک کو

چھین لینا امن کے منافی ہے اور ایسا مشورہ عاجلانہ مشورہ ہوگا۔ اِس لئے کہ امیر ہو یا غریب زندگی کا وقت سب کا معین ہے اور سب کی ملکیتوں میں "وارث و حوادث دو برابر کے شریک ہیں" اسی لئے دولت کے مصرف کو پہلے واضح کر دینا عقل والوں کا شعار رہا ہے اس کے باوجود اگر کوئی خود فریبی میں مبتلا رہے تو انقطاعِ مدت اور زوالِ نعمت کے قانون کی زد میں وہ آپڑیگا۔

نظامِ جاگیرداری حکومتوں کی ضرورتوں پر پیدا کیا ہوا ایک ادارہ ہے کہ اُن ضرورتوں کے ختم ہو جانے پر اس ادارے میں قوت و طاقت نہیں ہوتی۔ اس ادارے میں وہ انسان بھی ہیں جن کی قربانیاں جن کے ایثار و فدویت کے کارنامے جن کی سرفروشیاں اس امر کی مستحق تھیں کہ حکومت اُن سے مناسب سلوک کرتی اور ان کو مصائبِ دنیا کے خوفناک شکنجوں سے دور رکھا جاتا۔ اُن جری اور بہادر انسانوں کی نسلوں میں یقیناً آج بھی انسانی ہمدردی فرض شناسی، دردمندی باقی ہے۔ ان کو صرف یہ تبلانے کی ضرورت ہے کہ دنیا کے بدلتے ہوئے حالات میں۔ (۱) فکر کا انقلاب۔ (۲) سائنس کا صنعت پر اثر (۳) مواصلات کی وجہ بیرونی دنیا کا ربط و ضبط (۴) رائے عامہ کی طاقت (۵) فرد کی صلاحیتوں کو جمہور میں ختم کر دینے کی کوشش۔ یہ وہ صورتیں ہیں کہ

جن سے حکومتوں کے نظام متزلزل ہو رہے ہیں تو انفرادی زمینداری اور شخصی دولت کا کیا مقام ہے۔

عام انسانوں کا درد اگر انکو بے چین نہ کر دے فاقہ کشوں کی بھوک سے اگر یہ متاثر نہ ہوں۔ یتیموں کی فریاد اگر ان کے کانوں تک نہ پہونچے اور یہ عادتاً اپنے فرائض سے غافل ہو کر قانونِ حق کے معیّن کردہ ٹیکس کو بھی ادا نہ کریں تو ان کی تباہی قریب سے قریب تر ہو جائے گی اور ایسے ہی انسانوں کے لئے تقسیم زر کے وہ نظریات قائل ہو جائیں گے جو ہر انسان کو ذاتی ملکیت سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔

لیکن صاحبِ درد دولتمندوں کا وہ طبقہ جو اپنے عمل کو "قُلِ العفوْ" کی تفسیر بنا کر پیش کر رہا ہے (یعنی۔ جب یہ پوچھا گیا کہ کتنا انفاق کیا جائے تو یہ جواب ملا کہ "جو بچے") تقسیم زر کے ہر غلط نظریہ کی دستبُرد سے بچا رہے گا۔

آمدنی کے ذرائع جب موجود ہیں تو بچے ہوئے روپئے کو بڑی صنعتوں میں لگا دینا اور ان صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو اس کے نفع و نقصان میں برابر کا شریک رکھنا اور ان ہی مزدوروں کی رائے پر افسروں کا انتخاب یہی وہ چند اُمور ہیں جن سے مزدور بھی مطمئن ہو گا اور دولتمند بھی۔

بچے ہوئے روپئے سے مدرسوں، عبادت گاہوں، دواخانوں اور اسی قسم کے فلاح عامہ کے کاروبار اگر جاری کئے جائیں تو پھر تقسیم زر کے مطالبہ کا کیا مقام رہ جاتا ہے۔

مارکس ماحول سے مجبور تھا اس لئے ماحول کی تخلیق تھا۔ اِس نے تونگروں کی بے اعتنائی بھی دیکھی اور بے کسوں کی موت بھی۔ اِس کی نگاہوں میں اس کا اپنا ملک تھا اور اِس ملک کے دولتمندوں کی عیش پسندیاں تھیں جب کہ غریب سِسک سِسک کر مر رہے تھے لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہوتا کہ قلِ العفو کا بھی ایک الہامی نظریہ موجود ہے تو پھر وہ یا اُس کے ماننے والے اور اِس کے نظریات پر نظام حکومت کی بنیاد رکھنے والے خونیں انقلاب نہ پیدا کرتے۔

مقصد سب کا یہی ہے کہ دولت سیال رہے جامد نہ ہو مگر اُس کے لئے کیا وسائل اختیار کرنا چاہیئے وہ فطرت انسانی کے کسی کامل معلم سے پوچھئے جو نفس انسانی کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس مسئلہ کا حل نکالے۔ دولت کو ہمیشہ چند ہاتھوں میں رہنا ہے اور دولت ایک نشہ آور چیز ہے کوشش یہی کرنی ہے کہ نشہ نہ چڑھے طبیعت اعتدال پر ہو تو وہی دولت جو گناہوں کا مرکز ہے نیکیوں کی بنیاد بن جاتی ہے۔ جس زینت دنیا کو باقیات الصالحات بنانے کی کوشش ہر غدر

ومکر اور ہر دشمنی وبغاوت کا خاتمہ کر سکتی ہے۔

کون ہے وہ درد بھرا دل جو اِن تجاویز پر عمل کرے جو اپنی آمدنی میں خرچ کا تعین کرکے باقی سب بندگانِ خدا کیلئے صرف کردے جو خود آرام سے رہے مگر دوسروں کے درد دکھ سے غافل نہ ہو۔ کون ہے وہ تونگر جو اپنے کو امین جانے اپنی ذات کو ذریعۂ تقسیم دولت قرار دے اور اپنے ہاتھوں کو خزانوں کی بہتی ہوئی نالیاں فرض کرے کہ جس سے دولت سیال ہو کر بہتی نظر آئے۔ حقوق العباد کا ادا کرنے والا سب سے بڑا عبادت گذار ہے۔ اور بندگانِ خدا کی پریشانیوں میں بے چین ہو جانے والا دل سب سے زیادہ منحیرؔ ہوتا ہے۔

مارکس کا "معاشی نظام انسانی زندگی کے کسی اور پہلو کے پہچاننے کی صلاحیت نہیں رکھتا" وہ مزدوروں کی مصیبت و تکلیف کا تو اندازہ کرتا ہے لیکن اپنے ماحول سے مجبور ہو کر چند دولتمندوں کے دلوں میں درد اور تڑپ پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ وہ انسان کی نیکی پر بھروسہ کرنا نہیں چاہتا لیکن اس کو یہ نہیں معلوم کہ انسان کی نیکی سے قطعاً انکار کرنا بھی فکر کی غلطی ہے۔ نوع بشر کی ہر فرد بدنیت نہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر زار کی نیک نیتی پر حملہ کرکے دنیا کے سارے مزدوروں کو کیوں نیک نیت سمجھا جائے؟

فطرت فیاض جہاں ہر ایک انسان کو دیکھنے والی آنکھ اور سمجھنے اور محفوظ کرنے والا دل و دماغ عطا کرتی ہے تو ہر فرد کے باطن میں وہ احساس درد بھی مقدّر کر دیا جاتا ہے جو اگر بے عملی سے کسی ایک انسان میں مُردہ ہو جائے تو معاشرہ، حکومت، رائے عامہ اس کا احتساب کرے۔ لیکن اس کے باوجود کہ انسان کے باطن میں کچھ نیکیاں بھی ہیں قدرت اور اس کا قانون حکومت اور اس کا نظام، سزا و جزا کے خوف و طمع سے ان نیکیوں کو اُبھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس طرح وہ نیکیاں روبہ عمل آتی ہیں۔

تقسیم زر کے بہانے دولتمندوں کو فوری ختم کر دینا گویا۔ ملک کے خزانہ ہائے آب کو یکایک توڑ دینا ہے اُن کو باقی رکھتے ہوئے اُن خزانوں سے شہر کی آبادی کو متصل رکھنے کی کوشش کرنا ایک اچھے نظام حکومت کی دلیل ہے۔

روٹی کے مسئلہ کا حل یہ نہیں کہ دنیا میں خونین انقلاب برپا کیے جائیں حکومت کو چند ہاتھوں سے نکال کر دوسرے چند ہاتھوں میں منتقل کر دیا جائے۔ اکثریت کے ہر مناسب و نامناسب مطالبہ کو قبول کر لیا جائے۔

روٹی کے مسئلہ کا حل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ درسِ اخلاق کو عام کیا جائے درد کو قابل انتقال بنایا جائے۔ مفلس کو عزم اور تونگر کو ایثار کا سبق دیا جائے حاکم و محکوم کی درمیانی خلیج کو پاٹا جائے۔ معیار تکریم و بزرگی کو بدل دیا جائے اور یہ بھی واضح رہے کہ لاکھوں کو نیک بنانا اتنا آسان نہیں جتنا کہ چند انسانوں کو۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ساری دنیا کا معاشی نظام کبھی یکساں نہیں رہ سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ دنیا کا کوئی انسان کبھی بھوکا ہی نہ رہے۔ لیکن حتی الامکان معاشی دشواریوں کو دور کرنا ہمارے لئے لازم ہے۔ اور ایک عام حالت اطمینان کا پیدا کرنا ہمارا فرض۔ مذہب حق کے اصول و قوانین آج بھی انسانیت کیلئے وجہ سکون ہیں۔ جہاں اکتساب معیشت کے طریقوں کو یکساں نہیں بلکہ حق معیشت کو یکساں قرار دیا گیا ہے کہ جو جتنا چاہے حاصل کرے مگر سب کو ملے۔

روٹی کا حل نکالنے کیلئے مذہب کو ختم کر دینے کی کوشش سب سے زیادہ خطرناک ہوگی اس طرح سے لاکھوں اور کروڑوں انسان اُس باہمی احساس درد و محبت کو بھی کھو دینگے جسکو چند دولتمند انسانوں کے دلوں میں نہ دیکھکر ایک عالمگیر انقلاب کی بناء رکھی گئی تھی۔

انسانی ترقی صرف معاشی نظام کی نشو و نما نہیں۔ "معاشرتی نظام کی نشو و نما" ہے۔ جہاں معاشرے کو نیکی کی راہ پر لگانا ہر مفکر کا فرض ہو جاتا ہے اور معاشرے کی نشو و نما کا ایک جزو اس کا معاشی پہلو بھی ہے۔ اس لئے معاش کو زندگی کے ہر پہلو پر محیط سمجھنا زندگی کو اسکی اعلیٰ قدروں سے محروم کر دیتا ہے۔

کیا یہ حقیقت ہے کہ فکر انسانی کی نشو و نما صرف تقسیم زر کے مسائل پر منحصر ہے تو پھر ۱۸۴۸ء سے پہلے دنیا میں جتنے عظیم المرتبت مفکر آئے جنکے افکار پر ہمارے

تمدن و تہذیب کی عمارت کھڑی ہوئی ہے کیا وہ سب اسی معاشش کے تعلق خاطر ہی سے سوچ رہے تھے وہ مفکر جنکی زندگیاں مزدوروں کی زندگیوں سے پریشان تر گذریں۔ وہ مفکر جنہوں نے قید و بند کی صعوبتیں جھیلیں اور اور وہ مفکر جنکو شہر بہ شہر دیار بہ دیار جلا وطن ہو کر پھرنا پڑا مگر جنھوں نے صرف اپنے افکار سے انسانی رجحانات کے دھارے کو بدلنے کی کوشش کی اصلاح کا پرچار کیا انقلاب کا نہیں اور اسی میں انکی زندگیاں ختم ہوگئیں کہ نوع انسان کو نیک بنایا جائے۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ انسان سے اولین باپ کے گناہ کا بدلہ لیا جارہا ہے اور اسی پاداش میں اس کو فطرتِ بدملتی ہے تو پھر اچھائی کی ہر کوشش بے سُود ہوگی اور اچھائی کی کوشش کون کرے؟ وہی گناہگار باپ کا گناہگار بیٹا۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر انسان کی سوئی ہوئی فطرتِ نیک کو بیدار کرنا اس کو نیک منازل پر پہونچانا اس کے لئے نیک ماحول کا پیدا کرنا ہر نیک انسان کا اولین فریضہ ہوگا۔

نوع انسانی کے اصلاح کی ہر کوشش قابل مبارکباد ہے لیکن کسی خاص نظریئے کیساتھ جب کوئی ادارہ یا انجمن یا سوسائٹی ظہور پذیر ہوتی ہے تو یہ سمجھنا سخت دشوار ہوجاتا ہے کہ اس ادارہ کا قیام نوع انسانی کی محبت پر ہے یا اُس خاص ادارے کے دشمنوں کی عداوت پر۔ اور پھر یہ طے کرنا ہوگا کہ

کونسا کام اچھا ہے؟ وہ جسکی بنیاد محبت پر ہے یا وہ جس کی بنیاد عداوت پر رکھی گئی ہے۔

وقت ہے کہ فکر کی ساری توانائیوں کو عصبیت و حقارت کے جذبات سے پاک کر کے نوع انسانی کی عام اصلاح کے لئے صرف کیا جائے اور سچے اصولوں کو صرف اس لئے نہ ٹھکرایا جائے کہ وہ کسی مذہب سے منسوب ہیں۔

بے تاج کے شاہ

کاش اُن کے دامن کی وسعتیں واہب العطایا کی عنایتوں کے لئے وقف ہوتیں۔ کاش ان کے گریبان ان کو ذاتی محاسبہ کی دعوت دیتے۔ کاش اُن کے قدم غیرحق کی راہ میں نہ اُٹھتے۔ مختصر یہ کہ ان کا عمل علم کے ہموزن ہوتا تو آج سیاسیات کی دنیا میں یہ ہنگامے نہ ہوتے۔

اکلِ حلال کی طلب میں اگر قوم کے علماء محنت کرتے تو وہ ہمارے لئے درس ہوتا۔ یہ کاشتکار ہوتے۔ نجّار ہوتے۔ معمار ہوتے دن بھر روزی کے لئے خود محنت کرتے اور اپنے متعلقین کو محنت کی دعوت دیتے تو عوام آرام طلب نہ ہوتے۔

سائنس کی دنیا نے مذہب کے علمبرداروں کی توہین کی صرف اس لئے کہ وہ انکشافات عصریہ پر اعتماد کے لئے تیار نہ تھے۔ سیاست دانوں نے ان کو راستے کے کانٹے سمجھا اور اس لئے کہ اُن کا جمود حرکت کی طرف مائل نہ تھا۔ مملکت نے اُن کے حوالے اہم کام نہ کئے صرف اس واسطے کہ مملکت ان کو ذمہ دار نہیں سمجھتی۔ یہ سب کیوں؟ اسی لئے کہ ان کے علم و عمل میں کوئی تناسب نہیں۔ ان کے دعاوی کے لئے خود ان کی ذات میں دلیل نہیں۔ ان ہستیوں سے یہ مطالبہ نہیں کہ یہ زمانے کے رنگ کی طرح

بدین لیکن بجا طور پر ان سے یہ درخواست کی جا سکتی ہے کہ اب بھی وقت ہے اگر یہ بیدار ہوں تو قوم کی قسمت جاگے۔ مختلف زبانوں کو یہ سیکھیں جدید نظریات کا یہ مطالعہ کریں۔ طبعیات اور کیمیا کے اہم بنیادی مسائل سے بے خبر نہوں۔ اور پھر اپنے مقصد کو خارجی زبانوں میں دنیا تک پہونچائیں۔ ان کا ماضی ہمہ گیر اور ان کا مستقبل اس قدر محدود۔ آخر کیوں۔؟ علمی دنیا نے ان کو پیچھے ہٹایا۔ یا انھوں نے علمی دنیا کو پس پشت ڈالدیا؟ بولتے ہیں لیکن الفاظ میں جادو نہیں۔ لکھتے ہیں لیکن تحریر میں جان نہیں۔ بس اس لئے کہ عمل خالص نہیں۔ بڑھتی ہوئی ضرورتوں سے مجبور ہو کر سرمایہ دار کے دست نگر ہیں۔ انکی بکی ہوئی زبانوں سے مذہب کے احکام کی مصلحت آمیز تاویلیں۔ دنیا کو عین مذہب سے بیزار کر رہی ہیں۔

آج جبکہ تباہی و بربادی سے گھبرائی ہوئی دنیا مادیت سے بیزار ہوتی جارہی ہے۔ کیا علماء کا یہ فریضہ نہیں کہ وہ دنیا کو پیغام حق سنائیں اور انسانیت کو بڑھتی ہوئی پریشانی سے بچالیں۔

ان کا ادعائے روحانیت اگر بادلیل ہو تو یہی علماء آج پھر سیاست کے محور بن جائیں۔ طاقتیں ان سے خائف رہیں۔ ان کا حکم عوام سے گذر کر خواص کے لئے واجب التعمیل ہو۔ ایک دور وہ بھی تھا کہ

وقت ان کے لئے کافی نہ تھا آج یہ وقت کا گلا گھونٹ رہے ہیں۔

وقت ناشناسی اسی دور میں قیامت ہے اور جامعہ کیلئے موت۔

آج اگر ان کا علم عمل کے سانچے میں ڈھل جائے تو یہی بے تاج کے پادشاہ ہوں۔ عمل ان کا خزانہ ہو۔ زبان کی طاقت جدید ترین آلات حرب سے زیادہ قوی ہو۔ انکی خیر دانی وخیر اندیشی انکی مملکت کے حدود ہوں پھر دیکھیں کہ دنیا کا دم خم کیونکر ان کو نظر انداز کرتا ہے۔

ہمارے قید خانے

جن میں زنجیروں کی جھنکار درد سے کراہنے کی آوازیں پھر قدم قدم پر احتساب

گرفتاران بلا کے لئے محشر سے کم نہیں یہ ہمارے دفاتر ہیں۔ وہی جو ہم پر طاری ہیں۔

تمدن و تہذیب نے تقریباً ہر اہم مسئلہ کو ایک جُدا دفتر سے متعلق کر دیا ہے

لیکن یہ وحشت ہے کہ ہر دفتر دوسرے دفتر سے رم خوردہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

یہ دفاتر مختلف حکومتوں کے تحت ہیں جہاں کارروائیوں کو طویل کرنے کی باہمی

مسابقت جاری ہے۔

ایک سے زیادہ نسلیں جہاں ایک ہی کارروائی کے لئے سرگرداں رہتی ہیں۔

دفاتر سے ہر گھڑی یہ آواز سُنی جاتی ہے کہ کام زیادہ ہے کام کرنے والے

کم ہیں۔ اور عوام یہ صدا دیتے ہوئے گذرتے ہیں کہ غریبوں کی عمریں قلیل ہیں اور

دفتروں کی زندگی طویل۔

جہاں طاقتور بجلی کی طرح اپنا کام نکالے اور جو کمزور انسانوں کیلئے مسلخ بن جائے۔

صدر دفتر وہ خود تراشیدہ بُت ہے جس کی چوکھٹ پر پریشان حال انسانوں کی

بھینٹ چڑھائی جاتی ہے اور وہ خود ساختہ دیوتا ہے کہ اگر اس کی صحیح پرستش

نہ ہو تو ہر دعا رد اور ہر درخواست ٹھکرا دی جاتی ہے۔

ملک آزاد سہی لیکن ملک میں دفاتر کے یہ خداوند اپنے دفتر کو

غلام سازی کا کارخانہ بناتے ہیں۔ جن میں کام کرنے والوں کا فکر و شعور ہمیشہ غلام رہتا ہے جن کے لئے وظیفہ وہ منحوس ساعت ہے جب کارکردگی کے قویٰ مفلوج ہو جانے کے بعد زندان کا دروازہ کھول کر قیدیوں کو باہر پھینک دیا جاتا ہے۔ اور عادت سے مجبور حالات سے پریشان قیدی سر چھپانے کے لئے پھر دوسرے زندان کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔

انسانوں کا وہ طبقہ جو اہلکار پیدا ہوتا ہے اور اہلکار مرتا ہے۔ فکر سے محرومی اس کی قسمت ہے۔ اوقات دفتر سے ہٹ کر بھی اس کی زندگی فکر دفتر ہی میں گذرتی ہے۔ جس کے لئے سیاست جُرم اور مافی الضمیر کا اظہار غداری ہے۔ کیا ایسے پیٹ کے مارے مقید انسانوں کی فکر کبھی آزاد ہوگی؟ مجبوری کے عالم میں ان کا اہل دفتر ہونا کیا کوئی ایسا جرم ہے جس کی پاداش میں مدت العمر ان کی زبان بند رہیگی؟

دیانت داری، فرض شناسی، جفاکشی دفتریوں کے لئے اعلیٰ ڈگریوں سے زیادہ ضروری ہیں۔ لیکن ان سارے محاسن کی موجودگی میں ذمہ دار حکام کی بے جا اقربا نوازی، خوشامد پسندی، ظلم کیشی وحق پوشی جیسے مصائب روز بروز ان قید خانوں کو نہ صرف تاریک سے تاریک تر بنا رہے ہیں بلکہ فضا اس طرح زہر آلود ہو رہی ہے کہ جس سے سارے ملک میں زہر پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔

اگر اہلِ دفتر سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ فرض شناس اور دیانت دار ہوں تو حکام کے لئے بھی تواضع خوش اخلاقی حق رسی اور عدل گستری نہایت ضروری ہے تاکہ وہ خود اہل دفتر کے لئے ایک نمونہ بن جائیں۔

آزاد ممالک کا سرمایہ

وہ خزانہ جو حکومتوں کا وقار اور سلطنتوں کی عظمت ہے چاندی اور سونے کے سکوں سے زیادہ قیمتی۔ جواہرات جس کے سامنے بے قدر ہیں۔ یہ ملک کے نوجوان ہیں۔ جن کے عزم میں عسکری طاقتیں پنہاں اور جن کے قوی بازو قصر حکومت کے ستون ہوتے ہیں۔

کسی حکومت نے اگر اُن سے بے اعتنائی کی اور اگر اُن کو نہ سنبھالا تو وہ حکومت زوال پذیر ہے۔

راستوں اور گلیوں میں پھرنے والے نوجوان جن کی بظاہر آوارہ زندگی درد مند دلوں کے لئے پریشان کُن ہے۔ اگر اپنی تباہی اور بربادی کی ذمہ داری حکومت پر رکھیں تو بیجا نہیں۔ مانا کہ ان کا کردار کمزور اور اُن کے اخلاق خراب ہیں۔ یہ درست ہے کہ اِن کی نگاہ دوربین اور انکی عقل مصلحت اندیش نہیں۔ لیکن ان میں ایک مستقل عزم کا پیدا کرنا اور ایک نصب العین کا تعین ہر عاقبت اندیش حکومت کا پہلا فریضہ ہے۔ وہ فرض جو مدرسہ اور معلم کے حدود سے باہر مختلف اور ذرائع سے ادا کیا جاتا ہے۔ تعلیمات کے بعض مفکر ان کی اصلاح کے لئے تعلیم بالغان کی تجویز پیش کرتے ہیں۔ لیکن ملک کے نوجوانوں کے لئے یہ تجویز ایک مدرسہ کا تصوّر

پیش کرتی ہے جس سے اُن کو نفرت ہو چلی ہے۔ وقت آچکا ہے کہ حکومت مذہبی واعظوں کی طرح ایسے تعلیمی مقررین بھی معین کرے جو دورہ کناں ہوں۔ بچوں نوجوانوں اور ضعیفوں کو یکساں مخاطب کیا کریں جن میں بہرحال نوجوان اثر پذیر ہونگے اور یہ اثر پذیری دیرپا بھی ہوگی۔ آج نوجوانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ حوادث عالم کے سیلاب پر تنکوں کی طرح بہے جارہے ہیں۔ چونکہ اُن میں مستقل عزم نہیں اسلئے کوئی ان کا معین نصب العین نہیں۔ اور خود نصب العین کیسے معین ہو جبکہ اُن کے سامنے کوئی ایسا راستہ نہیں جس پر چلتے ہوئے وہ اپنے کو معاشی اور تمدنی طریقوں سے محفوظ جانیں۔

یہ ضروری ہے کہ ملازمتوں کے علاوہ انکے لئے مختلف ذرائع معاش کھولدیئے جائیں۔ اب یہ حکومت کی طرف سے ہو یا ملک کے دولتمندوں کی طرف سے بہرحال مختلف وسائل معیشت کی شدید ضرورت محسوس کی جارہی ہے تاکہ بیروزگاری کے مسئلہ کا حل نکل آئے۔ فکر کیلئے یہ تمیز بھی ضروری ہے کہ اس وقت عام تعلیم زیادہ اہم ہے یا بیروزگاری کا دفعیہ؟

وقت پر غفلت تباہی کا پیغام ہے اور نتیجہ پر مایوسی بربادی کی انتہا یہی غفلت و مایوسی آج نوجوانوں پر طاری ہے۔

ملک میں لاکھوں نوجوان افلاس کے ماحول میں پرورش پاکر اگر جفاکش اور دیانت دار بھی رہیں اور انتہائی پریشانیوں میں گھر کر کوئی تعلیمی سند بھی حاصل

کریں تو ایک بلند منزل تک پہونچنے کے لئے جتنی صبر آزما مدت درکار ہے وہ انکو کم ہمت اور بزدل بنانیکے لئے کافی ہے۔ اور اگر اتنا زمانہ آزمائش وابتلا میں بسر بھی کرلیا تو اس کا کیا یقین کہ چند متمول خاندانوں کے مقابل میں ایسے نوجوانوں کو اکثر ترقی کے مواقع ملتے رہیں گے؟ اس لئے ایک عام ناامیدی نوجوانوں میں پائی جارہی ہے۔ نہ صرف ملازمتوں میں بلکہ زراعت، تجارت، صنعت اور بالآخر سیاست میں بھی دولت کی شدید ضرورت ہے اور ملک کا نوجوان افلاس میں مبتلا ہے۔ پھر ترقی ظاہر! اسی افلاس نے انکی عزیز ترین دولت صحت کو برباد کر دیا ہے جسکی موجودگی میں شاید وہ ہر مصیبت پر قابو پاسکتے۔ حکومت کا سب سے اہم فریضہ یہ ہوگا کہ ان کے لئے کوئی مناسب حل نکالے یا تو ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے اتنے مختلف معاشی راستے کھولدیئے جائیں کہ یہ نوجوان اپنے حسب منشا اپنی منزلوں کو معین کرلیں یا پھر دولت کو معیار برتری نہ قرار دیا جاکر اسکی جگہ اعلیٰ کردار کو دیجائے جس کو تقویٰ کہا جاسکے۔ جس کا ایک جزو محنت بھی ہو ——

معیار بزرگی

انسان کی نگاہیں دولت یا روپیہ کی فراوانی سے کچھ ایسی متاثر ہوئیں

کہ روپیہ خیر محض قرار پایا۔ اور ساری عزت و توقیر اُسی کے لئے سزاوار ہوئی جس نے

کسی طرح سے ہو روپیہ کا ذخیرہ کر لیا۔ کبھی یہ نہیں دریافت کیا گیا کہ یہ کس طرح

جمع ہوا ۔ حکومت نے بھی (جو اجتماعی زندگی کے ارتقاء کے لئے ایک

لازمی ادارہ ہے) ایسے ہی افراد کی قدر افزائی کی جو متمول تھے اور انہی کو

ہر کام کا اہل سمجھا جن کے پاس روپیہ تھا۔ یعنی آج روپیہ عزت۔ توقیر۔

اہلیت و صلاحیت سے عبارت ہے۔

نیکی کے عام تصور میں ایک انقلاب رونما ہے۔ غریب کی نیکی فرض

اور امیر کی نیکی احسان ہے۔ دنیا کی نگاہوں میں جس کے پاس روپیہ نہیں

اُس کو مجبوراً نیک رہنا چاہئے ورنہ ذرا سے تساہل میں اُس سے سخت

مواخذہ لیا جا سکتا ہے۔ اور امیر کی دولت اس کے ہر جرم ہر بدکرداری

پر ایک پردہ ہے جو قانون کی قینچیوں سے بھی چاک نہیں ہوتا۔

جب یہی افراد حکومت کا اعتماد حاصل کر لیتے ہیں تو پھر ظلم و استبداد

کی کوئی حد نہیں رہتی۔ ایسے ہی نتائج سے باخبر ہو کر دنیا کے بہت سے انسانوں نے

ذاتی ملکیت کی مخالفت کی اور ایک ایسے نظام حکومت کی بنیاد رکھی جس میں

تمول اور فقر کا امتیاز نہ رہے۔ لیکن وہ قواعد جن سے اس امتیاز کو مٹانے کی کوشش کی فطرت انسان پر قابو نہ پا سکے۔ دو نظریات میں جنگ جاری ہے اور معلوم نہیں کب تک یہ جنگ جاری رہے گی۔

(۱) فرد اپنی ساری صلاحیتوں کو حکومت کے حوالے کر دے۔ اور حکومت فرد کی فلاح وبہبود کی ذمہ دار رہے۔

(۲) حکومت فرد کو آزاد چھوڑ دے اور اس وقت تک اسکی آزادی میں دخل نہ دے جب تک دوسروں کی آزادی میں خلل نہ پڑے۔

ایک مکتب خیال اشتمالیت واجتماعیت (اشتراکیت) کا ہے اور دوسرا انفرادیت اور جمہوریت کا۔ ان نظریات کی کشمکش نے دنیا کو آخر ہولناک لڑائیوں سے دوچار کر دیا۔ جو انسانی بہیمیت وبربریت کا ایک بدترین کارنامہ ہے۔ لیکن باوجود اس کے انفرادیت وجمہوریت میں تو بہر حال روپیہ معیار بزرگی رہا۔ اور ادھر روپیہ کی اجتماعی ہئیت کو زار سے چھین کر مزدور کے حوالے کیا گیا۔ چند ہاتھوں سے نکل کر دولت دوسرے چند ہاتھوں میں آگئی۔ تاہم معیار تو وہی باقی رہا کہ روپیہ نہیں تو کچھ نہیں۔

آج بھی طبقاتی پیکار اسی معیار مبادلہ کے لئے ہے جس کے زور پر انسان دوسرے انسانوں کو کمزور کر دینا چاہتا ہے۔

ان حالات میں یہ غور طلب ہو گیا ہے کہ کیا کوئی ایسے نظام حکومت کا

قیام ممکن ہے جس میں تموّل اور تونگری کی جگہ مسلسل نیک کردار اور پرہیزگاری کو رواج پائے
آج بے چین دنیا جب کہ ہر تجربہ کے لئے تیار ہے کیوں نہ ایسی ایک کوشش ہو کہ
یہ معیار بزرگی بدل دیا جائے۔

یہ سچ ہے کہ نیک اور پرہیزگار انسان وہ وسائل نہیں رکھتا جو ایک متموّل
کو اپنی شان و شوکت کے مظاہرہ کے لئے حاصل ہیں۔ مگر جب کہ خود شان و شوکت
کے معنیٰ بدل دیئے جائیں تو عجب نہیں کہ وہ ردّ عمل پیدا ہو جس سے تونگر خود پرہیزگار
بننے کی کوشش کریں اور آہستہ آہستہ یہ خواہش تکریم اُن کو پرہیزگار بنادے۔

تاریخ نے ایسے واقعات بھی پیش کئے ہیں جہاں دولتمندوں نے پرہیزگار
انسانوں کی عزت و توقیر کو دیکھکر ان کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھا اور اُس نیکی کو اپنی ذات
سے منسوب رکھنے کے لئے جا و بیجا کوشش کی۔ متموّل انسانوں نے یہ گمان کیا کہ شاید
دولت اُس عزت نفس کو بھی خرید سکتی ہے جو انسانی قلوب کو مسخر کرے لیکن آخر میں
سوا اس کے کچھ نہ ہو سکا کہ ظلم و استبداد کی ایک داستان رہ گئی اور بس!۔
کتنے بے گناہ بندے اس جرم میں تہ تیغ کر دیئے گئے کہ دنیا میں کچھ انسان اُنکی
توقیر دولتمندوں سے زیادہ کرتے ہیں۔ آج دولتمندوں کو اگر یہ فکر
ہے کہ بدلتا ہوا زمانہ اُن کی دولت چھین لیگا۔ تو یقیناً یہ فکر اُن کے لئے جان لیوا ہے
مگر وہ حقوق کو پہچاننے کی کیوں فکر نہ کریں اور ادائے حق کی طرف کیوں
متوجہ نہوں۔ کیونکہ یہی توجہ اُن کو اب زندہ رکھ سکتی ہے۔ جب یہ ثابت ہو کہ

روپیہ حصول مقصد کا ذریعہ نہیں تو روپیہ کو عین مقصد جان کر اُس کی شب و روز حفاظت ایک قاتل فکر ہے۔ جو دنیا کا چین بھی چھین لیتی ہے۔ دولتمند آج اس لذت سے محروم ہے۔ جو دوسروں کو کھلا کر کھانے اور دوسروں کو پہنا کر پہننے میں ہے۔ وہ حقیقت میں غیر مطمئن ہے اس لئے کہ اُس کے عزیز قرابتدار مُفلس ہیں اور اس کی دولت پر آنکھ لگائے ہوئے ہیں ـــــ وہ حکومت کے فولادی پنجے سے دب کر قانونی ٹیکس تو ادا کر دیتا ہے ـــــ مگر اخلاق ومذہب کی آواز پر بہرا اور گونگا ہے ـــــ حُقوق مذہب کی ادائی کے لئے بھی جب تک کوئی جبر و تشدّد نہ ہو وہ اپنی دولت کے کسی حصہ سے جُدا ہونے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے پاس دولت بزرگی ہے۔ اس لئے اس بزرگی کے معیار کو بدل کر بعض مفکرین نے محنت کا معیار پیش کیا۔ لیکن انسان کو کسی اور معیار تک پہونچنا ہے۔ تاکہ رفتہ رفتہ جبر و تشدّد سے گذر کر دنیا عادۃً نیکی کی منزل پر پہونچ جائے۔

اندھی ریس

جن ممالک میں آمدنی کے ذرائع زیادہ سے زیادہ مہیا ہوتے ہیں وہاں عموماً نسلیں تعلیم سے مالامال کردی جاتی ہیں۔ بہ اعتبار سیاست مسئلہ تعلیم کسی ملک کا اہم ترین مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ وہ خرچ کا صیغہ ہے جس کو عموماً دوسرے دفاتر کی ہمدردیاں حاصل نہیں ہوتیں۔ بچوں کی تعلیم قومی تعمیر ہے جو بغیر دولت کی فراوانی کے ناممکن ہے۔ اور جس کے لئے حکومت کی خصوصی اور ممکنہ امداد کے باوجود ماںباپ کی خوشحالی بھی لازمی ہے۔ جن ملکوں میں کاشتکاری ہو یا صرف سرکاری ملازمتیں وہاں تعلیم کا مسئلہ ایک مستقل غور و فکر چاہتا ہے۔ پیٹ کے مارے ماںباپ خود کھا کر پوری طرح پہن نہیں سکتے تو بچوں کی تعلیم اور پھر اعلیٰ تعلیم کا تصور اُن کے لئے وہ دل بھانے والا خواب ہے جس سے چونک پڑنے کے بعد وہ اپنے حال پر قانع رہنے کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور اپنے بچوں اور متمول خاندان کے بچوں کا تفاوت دیکھکر قدرت اور حکومت دونوں پر طعنہ زن ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ ممالک جو اپنی رعایا کی آمدنیوں کا لحاظ کئے بغیر متمول ممالک کے نظام تعلیم کو جزواً و کلاً رائج کر دیتے ہیں وہاں یہی تشویش عام ہو جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ کائنات کے کسی جزو کو

کُل سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور جبکہ سائنسی ترقی کے بعد دنیا محدود ہو کر ایک مستقل وحدت بن چکی ہے۔ ہم اپنے تعلیمی مسائل کو متمدن قوموں کے مسائل تعلیم سے علیحدہ نہیں کر سکتے ہیں۔ تاہم کیا یہ صحیح طریقہ فکر نہ ہوگا کہ ہم طبعی جغرافی اثرات ماحول اور اپنے اقتصادیات کے پیش نظر ایسی تعلیم کو رائج کرنے کی فکر کریں جس سے عمومیت مستفید ہو اور وہ ہمارے مناسب حال ہو۔

اپنی پستیٔ تعلیم کے لئے یہ دلیل نہایت پست اور احساس کمتری سے بھری ہوئی ہے کہ ترقی یافتہ دنیا سے ہم صدیوں پیچھے ہیں اس لئے تعلیم میں بھی وہی نسبت قائم رہنی چاہئے۔ ہمارے تعلیمی مُفکرّین کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہم اپنے طریقہ تعلیم کو متمدن دنیا کے طریقوں سے صدیوں آگے بڑھا سکتے ہیں اور اگر ہماری محکوم ذہنیت اُپج اور جدت سے بدل جائے تو دوسرے ہماری تقلید کرنے لگیں گے۔

بین الاقوامی کُلیات تعلیم میں مضامین تعلیم تو یکساں ہوتے ہیں لیکن طریقۂ تعلیم اور مدت تعلیم میں نمایاں فرق رہتا ہے۔ عالمگیر جنگ کا تصوّر اور احترام پیدا کرنے کے لئے کہیں کہیں بلا ضرورت بھی مکمل تاریخی یا وقت کا پیچھے ہٹا دیا جانا ضروری قرار پاتا ہے۔ اسی طرح آنے والی نسلوں میں احساس برتری اور شعور آزادی کی تخلیق کے لئے اہم مسائل کو باقی رکھتے ہوئے نظام تعلیم میں ایسے تغیرات ممکن ہیں جو ماحول کے مطابق بھی ہوں اور بین الاقوامی طور پر تسلیم بھی کر لئے جائیں۔

کیا غضب ہے کہ مشرقی زبانوں کی سندیں وہی مستند ہوں جو ایسے ممالک سے حاصل کی جائیں جنکا دُور کا تعلق بھی اُن زبانوں سے نہو اور حکومت اونچی تنخواہیں ایسی ہی سندوں کے لئے مقرر کرے۔ بجائے اس کے کہ ہر شعبہ میں ہم اپنا وقار قائم رکھتے اور ہماری سندیں غیر ممالک کے مزید استناد کی محتاج نہ رہتیں۔ ہماری مجبوریوں کا یہ حال ہے کہ چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی درسی کتابیں بھی فکر غیر کی مرہون منت بن رہی ہیں۔

شہر سے ہٹ کر دیہات کا عالم اور زیادہ عبرتناک ہو جاتا ہے جبکہ غریب بچوں کے دل و دماغ جو پہلے ہی سے فلاکت و ادبار کے پروردہ ہیں، بیرونی مسموم اثرات سے بھر دیئے جاتے ہیں۔ اور اسکے بعد حکومت جَو بو کر گیہوں کاٹنے کی فکر کرتی ہے اور ہر بار یہ آواز بلند ہوتی ہے۔ "قابل آدمی نہیں ملتا" آدمی کہاں سے ملینگے جب مدرسہ کا زمانہ عملی زندگی سے ربط ہی نہ رکھے۔ ایک تو نصاب تعلیم کا ناگوار تنوع طلبا کے دل و دماغ میں انتشار کا باعث ہے۔ دوسرے یہ کہ زمانۂ تعلیم مابعد تعلیم دَور سے اتنا مختلف ہوتا جا رہا ہے کہ ختم تعلیم کے بعد طالب العلم کو عملی دنیا کے قابل بننے کے لئے کافی مدت درکار ہوتی ہے۔

مدارس کی تعلیم کے لئے بڑے بڑے ممالک کے نقشے تو چھوٹے پیمانہ پر کھینچے جاتے ہیں لیکن خود مدرسہ کو عملی زندگی کا ایک مختصر پیمانہ نہیں بنایا

جاتا اِس لئے طویل مُدت تعلیم کے باوجود نتائج تعلیم حسب منشا نہیں اور پھر درمیانی عرصہ میں اگر متعلم مدرسہ چھوڑ دے تو وہ عملی زندگی سے ایسا دور ہوتا ہے کہ جیسے منجدھار میں کشتی ہو اور ساحل دکھائی نہ دے۔

نہایت ضروری ہے کہ سارا انتظام تعلیم ایک بار غور و خوض کا مرکز بنے تاکہ آنے والی نسلیں غریب ملازموں کی ہوں یا بے بس کاشتکاروں کی۔ حکومت کی طاقت بن سکے۔ تونگری و غربت تصور عام میں مقدر رہی۔ مگر انسانی مساعی کا یہ کمال ہونا چاہیئے کہ ان دونوں میں عظیم تر تفاوت کی خلیج کو اس طرح پاٹ دے کہ بچے جو فطرتاً امارت و غربت سے بے نیاز پیدا ہوتے ہیں ہمیشہ کے لئے اس تصور سے بے نیاز ہی رہیں۔

یقیناً ملک میں آج بھی ایسے قابل دماغ موجود ہیں جو تعلیم کے بہترین مفکر ہیں جن سے کچھ مصلحتوں کے سبب استفادہ نہیں کیا جارہا ہے یعنے بڑھتی ہوئی خود غرضیاں ملک کی عام تعلیم کو برباد کر رہی ہیں۔

سب سے زیادہ قیمتی کچرا

مکان و زمان کی لامحدود وسعتوں میں ہر محسوس و معلوم شئے کی اہمیت کا تصور باطل ہوتا جا رہا ہے تباہی و بربادی ہر شئے سے قریب تر نظر آ رہی ہے لامتناہی فضا میں ہماری زمین پر کاہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ہیئت کے علم برداروں نے زمین سے اُسکی پُرانی برتری چھین لی۔ اور علم حیاتیات کے ماہروں نے انسان اور اُسکی عظمت کو بے وقعت قرار دیا۔ مادی نفسیات نے خود عقلِ انسانی پر حملہ کر کے اُس کو کہیں کا نہ رکھا۔ مذہب کے ایک نکتہ نگاہ نے انسان اور اسکے ماحول کو آنی اور فانی قرار دیکر انسانی زندگی کو خواب پریشان بنا دیا اور ان سب پر اضافہ خود دُنیا کی مصیبتوں نے یہ کیا کہ قدم قدم پر انسان پست ہمت محروم و مایوس ہوتا چلا جا رہا ہے اور پھر ہر وقت آنکھوں کے سامنے پھرتی ہوئی موت کی ڈراؤنی شکل نے اس کے رہے سہے حواس بھی کھو دیئے۔ وہ انسان جو اپنے کو محورِ کائنات اور مرکز دائرہ خلقت سمجھتا تھا اپنی ہی جنس اور نوع کے ہاتھوں کچھ ایسا ذلیل ہوا کہ اس کی ساری برتری متاثر ہو چکی ہے۔

لاکھوں بلکہ کروڑوں ستم رسیدہ فاقہ کش انسان جن کا کوئی معیار زندگی نہیں۔ شب و روز اس دنیا کو اپنے لئے جہنم سمجھنے پر مجبور ہیں پھر جب وہ اپنی آنکھوں سے دنیا کی بڑی سے بڑی تہذیب کو تباہ اور بڑی سے بڑی

سلطنت کو کھنڈر کی صورت میں دیکھتے ہیں تو ان پر فنا کا ایک گہرا نقش مرتسم ہو جاتا ہے عمالقہ و فراعنہ، قیاصرہ و اکاسرہ کی وسیع ترین سلطنتوں کا نشان بھی جب تاریخ کے صفحات پر نہیں ملتا تو پھر اس پریشان روزگار انسان کا یہ تصور اور مستحکم ہو جاتا ہے کہ زندگی صرف کسی صورت وقت گذار دینے کا نام ہے۔ اس کے آگے کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ زندگی کی گوناگوں تلخیاں اور ذاتی تجربات عوام کو بس عوام ہی کے درجہ پر چھوڑ جاتے ہیں اور ان میں خواص سے صرف وہ انسان مراد ہوتے ہیں جنکو قدرت و قسمت کامیابی کے موقع عطا کر کے اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ تمدن و تہذیب معاشی اور سیاست کے اصول کی تدوین کر کے ان کو انسانی زندگی پر منطبق کریں اور ان قوانین کو روبہ عمل دیکھیں لیکن ایسی چند عقلوں کو بیچارگی اور سراسیمگی کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جبکہ عوام اپنے ذاتی ناکام تجربات کی وجہ سے تہذیب کو آگے بڑھانے والوں کے ہم آہنگ نہیں ہوتے اور اس طرح مختلف انسانوں اور ان کے طبقات میں باہم کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔

کتنے اِنسان قوانین قدرت کی زد میں آکر تباہ ہوتے ہیں اور کتنے آپس کی کشمکش سے ضائع و برباد ہیں۔ اس کا اندازہ روزمرہ کے واقعات سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ اِن کے علاوہ وہ انسان بھی اس دنیا میں ہیں جن کا ذریعہ نہیں اور بے سہارا ہونے کی وجہ سے ہر وقت پیچھے ڈھکیل دیئے جاتے

ہیں۔ یہ ضائع و برباد ہونے والے انسان گھر کا کچرا راستہ کی گرد۔ سڑی گلی ترکاری اور کاغذ کے پھٹے ہوئے پُرزوں کی طرح بلکہ ان سب سے بدتر سلوک کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔

اس صنعتی دور میں کچرے کی بھی اہمیت ہے لیکن بے وسیلہ انسان کا کوئی مقام نہیں۔ جس طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ گرد دامن سے پٹنے ہی کے لئے ہے یا قیمتی سامان اور در و دیوار پر جمنے کے لئے۔ بالکل اسی طرح عام انسانوں کے لئے یہ تصور یقین سے بدلتا جا رہا ہے کہ وہ صرف سوسائٹی پر ایک بار اور تمدن و تہذیب کے دامن پر ایک بدنما داغ ہیں۔

ایک صنعتی دماغ دنیا کی ہر بیکار چیز کو کارآمد بنانے کی فکر کرتا ہے تو کیا تہذیب و سیاست کے مفکرین کا یہ فریضہ نہیں کہ وہ دنیا کے اس سب سے زیادہ قیمتی کچرے کو مفید و کارآمد بنائے۔ دنیا کی متمدن حکومتیں امن کے دور میں اسی ایک مسئلہ کا حل ڈھونڈتی ہیں اور ان کی کامیابی کا راز بھی یہی ہے کہ وہ انسانیت کے رائیگاں اور بے کار جانے والے بہت بڑے حصہ کو اپنے لئے مفید بنالیں۔

تعلیمی سہولتوں کا بہم پہونچانا اس صورت حال کو کچھ نہ کچھ بدل دیتا ہے اور اس کچرے میں سے کہیں کہیں ہیرے اور یاقوت نکل آتے ہیں لیکن یہ مسئلہ کا مکمل حل نہیں۔ اس کے لئے تو حکومت کی مشنری کے ہر رکن کا

متحدالخیال ہوکر باہمی تعاون کیساتھ ایک مرکز پر جمع ہونا لازم ہے تاکہ تمام محکموں سے تعاون واتحاد کے بعد کوئی ایسی راہ نکل آئے جہاں انسان پیٹ سے بے نیاز ہوکر اپنے مذاق کے مطابق تعلیم پائے اور تعلیم پاکر اپنی زندگی کی فلاح کا کوئی راستہ ڈھونڈے اور پھر خود مطمئن ہوکر بے کار انسانوں کو مفید بنانیکی کوشش میں مصروف ہو جائے۔

مہلک بیماریاں

اِس دور میں بیماریوں کی گنتی امکان سے باہر نہیں کیونکہ صحیح معنی میں مردم شماری کا رجسٹر بھی امراض شماری کا رجسٹر ہے ۔ جتنے انسان اتنی ہی بیماریاں ۔ انکشافات عصریہ کی وجہ سے اگرچہ اکثر و بیشتر بیماریوں پر قابو پالیا گیا ہے لیکن ابھی لاکھوں ایسے امراض موجود ہیں جن پر فتح پانا آسان نہیں ۔

ملک بھر میں مشغول و مصروف دواخانوں کی کثرت کے باوجود صحت عامہ کا پُرخطر حالت میں رہنا قوم کی تاریک قسمت کو ظاہر کر رہا ہے ۔ لیکن قوم کو سب سے زیادہ خطرہ جسمانی امراض سے نہیں بلکہ روحانی امراض سے ہے ۔ کمی بصارت کا علاج مشکل نہیں لیکن کوتاہی بصیرت کا مداوا سخت دشوار ہوتا جا رہا ہے ۔ ثقل سماعت و کمی ذوق و لمس کی اصلاح ممکن ہے لیکن امتیازِ نیک و بد کیساتھ حسنِ قبول کا پیدا کرنا اچھے سے اچھے معالج کو ناکام کر دیتا ہے ۔ ٹھنڈے جسموں میں حرارت کا پیدا کرنا سہل ہے لیکن عمل میں حرارت کی تخلیق سہل نہیں ۔

فحاشی جسم کو مال دنیا کے لئے دوسرے کی مرضی پر چھوڑ دینے کا نام ہے ۔ لیکن دل و دماغ کی فحاشی کہیں زیادہ خطرناک ہے ۔ جہاں انسان تھوڑے سے فائدے کے لئے اپنے دل و دماغ کی صلاحیتوں کو دوسروں کے اشاروں پر صرف کر دے

شراب کا نشہ مہلک ہے لیکن اقتدار کا نشہ مہلک تر ۔ اگر انسان اپنے

سائنسی معلومات سے جسمانی امراض پر قابو پا سکتا ہے تو کسی نہ کسی صورت حیات اجتماعی کی بقاء و ارتقاء کیلئے اس کو رُوح کے امراض پر بھی قابو پانا چاہئے۔ اور یہ آسان نہیں اس کیلئے جد و جہد کرنی پڑیگی نسخے تجویز کرنے ہونگے پرہیز مُعین کرنا ہوگا مناسب تیمارداری کی ضرورت ہوگی پھر شاید کامیابی ہو۔ کیونکہ جسم کے متعدی امراض کیطرح روح کے امراض بھی شدت سے متعدی ہوتے ہیں اور ہمیشہ ایسے بیماروں کو اجتماعی زندگی سے ہٹا کر زیر علاج رکھنے کی ضرورت داعی ہوتی ہے۔

روح کی وسعتیں اگر ثابت ہیں تو ہر روح کیلئے امراض بھی لاتعداد ہوں گے خواہشات و میلانات کا غلط راستے پر جانا ایسے کئی امراض کی تخلیق کرتا ہے جنکا علاج ناممکن قرار پائے اور علاج اسی لئے ناممکن ہوتا ہے کہ ایسے بیمار اپنے کو ہر وقت صحیح اور تندرست جانتے ہیں۔ جسمانی حیثیت سے کسی تندرست انسان کا وہم میں مبتلا ہو کر اپنے کو بیمار سمجھنا اور روح کے بیمار کا اپنی صحت جسم پر اعتماد کر کے خود کو تندرست جاننا وہ بیماریاں ہیں جو لاعلاج سمجھی جاتی ہیں۔ ذہنی خلفشار کو اصابتِ رائے، خواہش اقتدار کو خدمت خلق و ہٹ دھرمی کو استقلال اور حسد کو تنقیدِ صحیح جاننے والے خود بخود اپنے باطنی امراض کا پتہ دیتے ہیں لیکن خود اپنے کو صحیح المزاج سمجھ کر ذاتی محاسبہ کیلئے تیار نہیں۔ درآنحالیکہ یہ سب متعدی امراض ہیں جنکی موجودگی میں ساری قوم غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔

اسباب و نتائج

ساری کائنات ایک علّت و معلول کا سلسلہ معلوم ہوتی ہے۔ ہر نتیجہ ایک یا کئی اسباب رکھتا ہے۔ لیکن یہ نہ کھُل سکا کہ نتیجہ پہلے سے معین تھا اور اُسی نسبت سے اسباب پیدا کئے گئے۔ یا خود سبب نے نتیجہ کی تخلیق کی اور اسباب پہلے سے موجود تھے۔ بہرحال فکر و شعور کی دنیا تو اسباب سے نتائج تک پہونچتی ہے۔ اور نتیجہ اور سبب کا باہمی ربط پہچان کر ارباب سیاست ایسے اسباب مہیا کرتے ہیں جو اُن نتائج کو پیدا کر سکیں جو کسی سوسائٹی معاشرہ۔ ملک اور ریاست کے لئے مُفید ہوں۔ سیاس پہلے نتیجہ کو مُعین کرتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے ذرائع ڈھونڈتا ہے یہی ذرائع اسباب ہیں۔ اگر یہ اسباب صحیح طریقوں پر آگے بڑھ رہے ہوں تو سیاست دان بڑی آسانی سے اپنے مقصد کے حصول کی پیش قیاسی کرتا ہے۔

انسانوں کا ہر طبقہ اپنے اپنے معیار فکر پر پیش قیاسی کا عادی ہے اور فطری طور پر عموماً سارے انسان آنے والے زمانے کے متعلق متجسس رہتے اور اسی لئے نجومیوں، رمّالوں اور جفّاروں کا خوب پیٹ بھرتا ہے علم فراست الید کے جاننے والے یعنی ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر آنے والے واقعات تبلانے والے بہت سے انسانوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ اطلاعات صحیح ہوں یا غلط متوہم

افراد پر کافی اثر انداز ہوتے ہیں۔ متمدن و مہذب ممالک میں بھی عورت، مرد بوڑھے، جوان اپنے متعلق آیندہ کی خبریں سننے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں لیکن ایسے تمام انسان خود اپنا کوئی مستقبل معین نہیں کرتے اس لئے اُن کے پاس کوئی معین اسباب بھی نہیں ہوتے۔ ایسے انسان اپنے آپ کو وقت کے سیلِ رواں پر ڈال دیتے ہیں اب وہ جہاں لے جائے۔

قوموں کی زندگی میں مقصد و مسلک کا تعین بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اور بغیر مقصد و مسلک کے کسی قوم کا آگے بڑھنا کشتی کو موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ہے مگر صرف تعینِ مقصد اہم نہیں بلکہ اس کے حصول کے لئے مواقع و اسباب کا پیدا کرنا اس سے زیادہ اہم ہے۔ یہی وہ منزلِ امتحان ہے کہ جہاں اسباب کی غلطی کی وجہ نتائج غلط ہو جاتے ہیں اور سیاست ناکام قرار دیجاتی ہے انسان کی شاہراہِ ترقی پر کئی نشان لگے ہوئے ہیں جو اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ سیاست میں ہمیشہ کیلئے ایک ہی مقصد معین نہیں ہوتا ہے بلکہ جیسے جیسے راستہ کٹتا چلا جاتا ہے ہر مقصد ایک سبب بنکر دوسرے مقصد کا پتہ دیتا ہے تاکہ تمدن و تہذیب کا ارتقا جاری و ساری رہے۔

مستقبل کو ہمیشہ ماضی سے بہتر بنانے کی کوشش لازمی ہے صرف یہ سمجھنا کہ یہ ہمارا دستور رہا ہے تاریک ماضی کی طرف لوٹنا ہے اور یہ فکر کہ اب ہمارا دستور کیسا ہونا چاہیے روشن مستقبل کی طرف آگے بڑھنا ہے۔ سیاست کی دنیا

ہیں ہر دستور اپنے وقت پر کامل سہی لیکن وقت کے گذر جانے کے بعد اگر اُس میں مناسب اصلاح اور ضروری تعمیر نہو تو آگے بڑھتی ہوئی دنیا اور پیچھے ہٹتے ہوئے انسانوں میں ایک کشمکش سی شروع ہو جاتی ہے۔ جہاں وقت کا سیلاب نہیں رُکتا اور پیچھے سے آنے والے اِن رُکے ہوئے یا پیچھے ہٹتے ہوئے انسانوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے آج سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس اصلاح و تغیر سے ہم اپنی سیاست کو کامیاب و کامران بنا سکتے ہیں۔

اگرچہ پرندے اور حیوان بھی موسم کے تغیر کا بہت پہلے سے پتہ چلاتے لیکن متفکر و باعمل انسان سیاسی تغیرات کی صرف پیش قیاسی ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے حسب مرام تغیرات پیدا کرنیکی کوشش میں خود اُن آثار و اسباب کو پیدا کرتے ہیں جو جانوروں اور عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔ اور عام انسان پیدا کردہ اسباب کو نہ پہچان کر اس بلند منزل کو مقدر سمجھنے لگتے ہیں جو ایک کامیاب سیاس کے لئے صرف ایک منزل ہے جہاں سے پھر اس کو آگے بڑھ جانا ہے۔

دنیا کا ہر مرتب شدہ دستور چونکہ الہامی نہیں ہوتا اس لئے ایک مناسب وقت تبدیلی چاہتا ہے۔ لیکن ہر تبدیلی کے وقت یہ امر ملحوظ خاطر رہنا چاہئے کہ اپنی پسند و ناپسند کا انحصار غیروں کی پسند و ناپسند پر نہو۔ مُردوں کی آنکھ اور پرائی عینک سے اپنی دنیا کا اندازہ لگانا بڑا ظلم ہے۔ یہ سچ ہے کہ انسان ہر منزل پر رہبری چاہتا ہے وہ فطرتاً نقال ہے اور ہر مقصد کیلئے وہ یقیناً کسی کی

تقلید ضرور کریگا۔

آنکھ روشن سہی لیکن رات کی تاریکی میں بیکار ہوئی جاتی ہے جب تک کہ خارج سے روشنی کا انتظام نہو۔ انسان انسان کا بچہ سہی لیکن حیوانوں میں پل کر انسان نہیں رہ سکتا۔ حواس پر عقل کا دار و مدار ہے اور حواس کی غلطی عقل کی غلطی ہے اس لئے راہِ عمل معین کرتے وقت کسی ایسے غیر فانی دستور کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے جو انسانی ارتقا کے منازل میں ہر قدم پر انسان کا ساتھ دے۔

عقل انسانی غلطیوں سے منزّہ نہیں اور فکر انسانی کا نقص ظاہر ہے ناقص افکار کا مجموعہ ناقص ہوگا۔ انسان نوامیس قدرت تو کیا خود اپنے آپ پر بھی حقیقی قدرت نہیں رکھتا۔ اس لئے مکمل اقتدار انسان کے لئے عملاً ناممکن ہے۔

اپنے محدود ماحول کے معائنہ سے گذر کر من حیث الکل اس پوری کائنات کے ایک وسیع اور عمیق مطالعہ کی ضرورت ہے۔ لازم ہے کہ اُصول معاش و معاد کے پیشِ نظر انسان کے لئے صرف حکومت و ریاست مقصد نہ رہے۔ حکومت و ریاست صرف حصول مقصد کا ذریعہ ہے اور حقیقی مقصد حیاتِ انسانی کے معیار کی بلندی ہے وہ معیار بلند جو انسان کو جسمانی و روحانی حیثیت میں ایک مقتدر اعلیٰ سے قریب و قریب تر کر دے۔

ادب کی غلط خدمت

ملک کی سیاست میں ادب کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ عام زبان جو کسی ملک میں بولی جاتی ہے اگر اپنے ادب کے معیار کو بلند نہ رکھے تو یہ سمجھ لینا حق بجانب ہوگا کہ وہاں کی سیاست کا معیار بھی پست ہے۔ تمدن و تہذیب کی عمارت کا سارا انحصار متعلقہ ادب پر ہوتا ہے۔ عام تعلیم کی پستی اور ذہنی غلامی ادب کے اعلیٰ معیار کے لئے سم قاتل ہے اور عموماً مختصر سی تعلیم کیساتھ ہمارے لکھنے والے جب ادیب بنکر قوم کے سامنے آتے ہیں تو اُن کا ذہن سوا اندھی تقلید کے آزاد فکر کی طرف مائل ہی نہیں ہوتا۔

ملک کے تمام لکھنے والوں پر ایک گہری نظر اس سطحی علم کا پتہ دیگی جو ہمارے نام نہاد ادیبوں کا سرمایہ ہے۔ یہ درست ہے کہ افسانے، ڈرامے، غزل اور گیت بھی ادب کے اجزا ہیں لیکن خود ان اجزا کا نقص اور پھر ان کا ناخوشگوار امتزاج ادنیٰ قسم کے ادب کی تخلیق میں مصروف ہوکر تمدن و سیاست کے دامن پر ایک بدنما داغ بن رہا ہے۔ نظم و نثر کے لکھنے والوں کی روز افزوں زیادتی اور اُن کا اپنے نتائج فکر کو عجلت سے بازار کے حوالے کرنا ادب کی ایک غلط خدمت ہے اور ذاتی مفادات کے پیش نظر جس کی طرف توجہ نہیں کی جا رہی ہے۔

حقیقی شاعر قوم کے لئے ایک پیغامبر ہوتا ہے اور حقیقی نثار اپنی حکمت سے

اُن رجحانات کو پیدا کرتا ہے جن سے عام بیداری اور حُریتِ فکر ظاہر ہوتی ہے۔

اقوام عالم کی قسمتوں کے ستارے جگمگا اُٹھتے ہیں جب کبھی اُن میں مسلسل باشعور لکھنے والوں نے اعلیٰ افکار کی تخلیق کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم میں بھی ایسے پیغامبر و حکیم گذرے ہیں کہ جن پر قوم کی تعمیر کا دارومدار رہا ہے لیکن اس سلسلہ کا بار بار منقطع ہو جانا اُس خلا کو پیدا کرتا ہے کہ جس کے بعد ادب کی سراسیمگی کو دور کرنے کے لئے آنے والے ناظم و نثار کو پھر شروع سے کام کرنا پڑتا ہے۔

اس دور کے علمی اور ادبی کارناموں کا مجموعہ اگر یہی ہے جو اس وقت بازار میں عام بکنے والی کتابوں، رسالوں اور سالناموں کی صورت میں پایا جا رہا ہے تو بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نام نہاد مجموعۂ ادب ہمارے تمدن و تہذیب پر ایک کاری ضرب ہے۔

محدود مطالعہ تنگی نظر کا باعث ہوتا ہے جس کے بعد صرف تجارت کی خاطر غلط ذوق تالیف اس جنسِ خام کو بازار کے حوالے کرتا ہے جو تھوڑے ہی عرصہ میں متعفن ہو جاتی ہے اور فضا کو مسموم کر دیتی ہے۔ یہی وقت ہے کہ اب ان کارناموں کا بے لاگ جائزہ لیا جائے۔

نامناسب پردہ

تقریباً ہر ذی شعور انسان یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی تربیت کا سارا دارومدار اس بنیادی تربیت پر ہوتا ہے جو ماں کی آغوش میں حاصل ہوتی ہے۔ لیکن کتنے ایسے انسان ہیں جنہوں نے اس تربیت کے ادارے کو اوجِ کمال پر پہونچانیکی کوشش کی ہے؟ یا اس ادارہ کے مساعی کو مشکور سمجھا ہو؟

عورتوں کی تعلیم و تربیت کے مسائل میں روز افزوں پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں اور معاشی نکتہ نگاہ سے طبقۂ نسواں کی اکثریت اُس فلاکت و ادبار میں مبتلا ہے جو صحیح تعلیم کی راہ میں حائل ہے۔

دولت اور افلاس کے قاتل فرق نے مردوں سے زیادہ عورتوں کو متاثر کر رکھا ہے نکبت، فلاکت، فقر اور فاقے کے عالم میں جن گھرانوں کی بسر بُرد ہو رہی ہے وہ جب کبھی سرمایہ دار خاندانوں کی مغرور عورتوں کے ناروا سلوک پر غور کرتے ہیں تو غریب مصیبت زدہ عورتوں کی ہمتیں اور بھی پست ہو جاتی ہیں۔ اِس طرح قوم کی کشتی گرداب کے حوالے ہو رہی ہے۔

مصیبت زدوں کی اکثریت پر تونگروں کی اقلیت ایک ہمدرد نگاہ بھی نہیں ڈالنا چاہتی۔ پہنے۔ اُوڑھنے۔ کھانے اور پینے کے طریقوں میں اس درجہ اختلاف ہے کہ جس سے قوم کی ہم آہنگی کو شدید ترین خطرہ لاحق ہے۔ اور پھر

شادی بیاہ جہیز اور دیگر رسوم کی حد تک طبقاتی کشمکش نے تو ایک قیامت برپا کردی ہے۔ یہ مسئلہ اتنا بدیہی ہے کہ شاید ہی کوئی گھر اس سے بچا ہوا ہو اس کے باوجود صرف چند دولتمند گھرانوں کی بیجا نمائش اور دکھاوے کے شوق نے نمونہ بنکر غریب گھرانوں کی تعلیم پائے ہوئی لڑکیوں کو زندہ درگور کر رکھا ہے۔ یہی وہ وجہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں عورتوں کا ہر کلب اصلاحی پروگرام رکھنے کے باوجود ناکام ثابت ہو رہا ہے۔

ادّعائے مساوات اور فکر آزادی درست سہی لیکن اس سلسلہ میں وہ طریقے بھی اختیار کئے گئے جس نے غریب اور امیر کے فرق کو واضح سے واضح تر کر دیا۔ اور پھر ممالک غیر کی بے موقع ریس نے کچھ ایسی عادتیں رائج کر دیں کہ معیار زندگی غیر شعوری طور پر اونچا ہوتا گیا۔ اب عام گھرانوں کی عورتیں اس معیار کو برقرار رکھنے کے لئے یا تو اپنا سب کچھ لٹا دیں یا پھر اس بلند معیار زندگی کو ٹھکرا کر اجتماعی زندگی میں ایک پیکار پیدا کر دیں جس کا لازمی نتیجہ مفلس طبقہ کی تباہی ہوگا۔

قوموں کی زندگی میں عورت کو وہ با رفعت مقام حاصل ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مختلف قوموں کی موجودگی۔ امیال و عواطف کی بے ربطی، ذاتی بے اعتمادی اور جابر و مستبد نگاہوں کی فریب کاریوں سے بچنے کے لئے اس ملک میں عورت کو حقیقی قفس کے حوالے کر دیا گیا اور پردہ کی

اِس مسخ شدہ صورت نے نہ صرف معاشی دشواریاں پیدا کیں بلکہ تعلیم و تربیت تمدن و سیاست۔ غرض زندگی کے ہر شعبہ میں عورت کو نہ صرف کمزور بلکہ معطل قرار دیا گیا۔

اس دائم الحبس طبقہ کی محدود نگاہوں نے فکر کو بھی محدود کر دیا۔ صحت عام متاثر ہوئی اور پھر نوکر یا خدمت گار رکھنے کی استطاعت نہ ہونے کے باوجود بازار تک نہ پہنچ سکنا، اور کام کاج کرنے والوں کی تلاش میں ناکامی نے غریب عورتوں کو اور زیادہ مفلس و اپاہج بنا دیا اور پھر آج ملازمین کا اونچی تنخواہوں کے لئے مطالبہ غریب خاندانوں کو بے دست و پا کر رہا ہے۔

دولتمندوں اور حکام کے وسیع محلات کی بلند دیواروں کا سایہ جب چھوٹے چھوٹے تاریک مقبروں پہ پڑا ہے تو پردہ کی یہ صورت عام ہوئی جو قانون حق میں بھی نہیں ہے۔

مختلف گھرانوں کے لباس میں فرق ہی لیکن ایک طرح کا اور ایک رنگ کا مقنعہ و برقعہ وہ ہم آہنگی تو پیدا کر لیتا جس سے بظاہر رجحانات کا فرق مٹ جائے اور غریب و امیر یکساں دکھائی دیں۔ بازاروں میں عورتیں اپنا کام خود انجام دیں اور اس طرح کوتاہ نظری خوف و ہراس قوم کے ایک بڑے حصہ سے دور ہو۔ زنانہ تعلیمی اداروں میں بھی اگر یہ برقعہ رواج پا جائے تو حکومت کے لئے بھی ایک طرف سہولت ہو اور دوسری طرف خود طالبات کا

کافی وقت جو نامناسب سواریوں میں صرف ہوتا ہے بچ جائے۔

طبقہ نسوان کے لئے آج جتنی دشواریاں درپیش ہیں اُن کا اکثر و بیشتر باعث غلط پردہ۔ کہنہ روایات اور قدیم رسمیں ہیں جنکو صرف وسعت نگاہ سے دور کیا جا سکتا ہے۔ دور از کار رسم و روایات کے دردناک نتائج اور دورِ جدید کی پُرفریب عادتیں افراط و تفریط کے وہ قاتل مظاہر ہیں کہ اگر کوئی راہِ اعتدال نہ قائم کی جائے تو اِس طبقہ کی ہلاکت کے ساتھ قوم کی تباہی مُسلّم ہے۔

چند حقائق

بہر حال حقیقتیں خود بخود منکشف ہو جاتی ہیں اور اُن پر پردہ ڈالنے کی ہر کوشش ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کوئی عالمگیر لڑائی ختم ہوتی ہے تو نظریات کی شکست و فتح کا اعلان ہوتا ہے اور عموماً فاتح قومیں دشمنوں سے کہیں زیادہ گھاٹے میں رہتی ہیں اور اُن کے مادی نقصان کا کوئی صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اگرچہ اُن کے نظریۂ حکومت کی فتح ہوتی ہے تاہم ختم جنگ کے بعد ہی سے وہ نظریہ آہستہ آہستہ بدلتا چلا جاتا ہے اور وہ طریقۂ حکومت باقی نہیں رہتا جو جنگ سے پہلے تھا۔ چنانچہ آج ما قبل جنگ جمہوریت کا تصوّر کامیاب نہیں رہا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عالمگیر لڑائیوں میں مال کے علاوہ آدمیوں کا بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے اور زمانہ مابعد جنگ میں مختلف امراض کے پھیل جانیکی وجہ موت کا بازار گرم ہو جاتا ہے لیکن اسکے باوجود کیا واقعی شہر اور گاؤں ویران ہو جاتے ہیں؟ کیا دارالسلطنت اور اُس کے اضلاع یا دیہات میں مکانات خالی نظر آتے ہیں؟ کیا آدمیوں کی چہل پہل میں کوئی خاص کمی محسوس ہونے لگتی ہے؟ ___ قطعاً نہیں بلکہ مسافروں کی کثرت سے سفر مشکل ہو جاتا ہے ہر بڑے شہر میں آبادی کے غیر معمولی اضافہ کا اعلان ہوتا ہے۔ خالی مکان

شکل سے نظر آتے ہیں اور یہ سب اس لئے نہیں کہ دیہات کے آدمی شہروں میں چلے آگئے۔ بلکہ خود دیہات میں بھی مکان کا ملنا دشوار اور اضافۂ آبادی کے سبب غلّہ کی تقسیم دشوار تر ہو جاتی ہے۔

آبادیوں کے اضافہ کا مسئلہ شرح موت وولادت کے گہرے مطالعہ کی دعوت دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک اچھے نظامِ حکومت کے لئے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اس بڑھتی ہوئی آبادی کی اصلاح حال کی طرف فوری متوجہ ہوجائے۔ کسی ملک کے نظم ونسق کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کے بڑھتے ہوئے ضروریات کی فراہمی اور تکمیل سے وہ عاجز نہ ہو اور چونکہ دارالسلطنت سے کہیں زیادہ آبادی اضلاع ودیہات کی ہوتی ہے اس لئے ملک کے تمام باشندوں کی زندگی کے طریقوں میں خواہ وہ کہیں ہوں وہ ہم آہنگی اور یکانگت پیدا کرے جس سے تمدن وتہذیب کی راہ میں شہری اور دیہاتی کا فرق کوئی رکاوٹ نہ ڈال سکے۔

یہ فرق تعلیم وتربیت کی فراوانی سے بہت کچھ دور ہو سکتا ہے لیکن اگر اضلاع اور دیہات کے رہنے والوں کو عصری ایجادات سے مستفید ہونے کے مواقع حاصل ہوں اور اُن کے لئے برقی قوت کی فراہمی اگر عام کردیجائے زراعت اور کاشتکاری کے لئے جدید ترین آلات مہیّا ہوں اور ہر شہری ودیہاتی کے لئے صاف وسادہ لباس کی یکرنگی تجویز کیجائے تو

بڑی حد تک تہذیب وتمدن کی ترقی ممکن ہے۔ عموماً جب ملک کو خود مکتفی بنانے کیلئے مختلف صنعتوں کا آغاز ہوتا ہے تو ملازمتوں سے رغبت خود بخود کم ہو جاتی ہے اور اس صورت سے بھی نزدیک و دور کے رہنے والے متحد الخیال ہونے لگتے ہیں لیکن ہم کہاں ہیں؟

اگر مابعد جنگ منصوبہ بندی میں مذکور الصدر مسائل بھی آچکے ہیں تو انھو روبہ عمل لانے کیلئے کیا وہ حرارت وحرکت بھی موجود ہے جو دوسرے متمدن ممالک میں پائی جاتی ہے؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ کبھی کسی ملک کا نظم ونسق بیرون ملک کے رہنے والوں کے ہاتھ میں نہیں دیا جاتا کیونکہ ایسے ہاتھ صرف دستار سنبھالنے میں مصروف رہتے ہیں اور چونکہ حقیقی ہمدردیاں نہیں ہوتیں اس لئے عوام سے کبھی ہاتھ نہیں ملاتے۔ یہی بے تعلقی اور خود پرستی بہترین تجاویز کو بھی روبہ عمل ہونے نہیں دیتی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک وسیع ملک اپنے جنگلات کے خزانوں اور زرخیز زمینوں سے وہ بے شمار وسائل مہیا کرسکتا ہے۔ جو اس ملک کو خود مکتفی بنانے کے لئے کافی ہوں لیکن جب حکومت کے کچھ خودغرض کارندے ذراسی لالچ میں ملک کی ہر پیداوار کو چوری سے باہر بھیج دیں اور اقرباء حکومت ہونیکی وجہ سے باز پرس اور سزا سے بے خوف ہوں تو پھر ملک ہمیشہ دوسروں کی گدائی کرتا رہے گا۔ اور ہر آن اس کا خوف بڑھتا چلا جائیگا کہ دیکھیں باہر کی رسد کب موقوف ہو اور ملک پر کیا گذرے! خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ امداد طلب کرنے والے ہر طرف سے منقطع ہوں۔ کسی ملک کے لئے متوسط موجوں پر نشریات کا دارومدار انتہائی غیر مفید ہو جاتا ہے۔ شاید اب وقت آگیا ہے کہ ملک کے

سنجیدہ افراد اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں اور انکی سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ملک بھر میں جہاں کہیں بے راہ روی دیکھیں حکومت کو فوری مطلع کر دیا کریں اور مفادِ عامہ کے لئے جس امر کو ضروری جانیں اس کی نشر و اشاعت سے گریز نہ کریں۔ صرف مدیرانِ جرائد پر ہی سوچنے اور لکھنے کی ذمہ داری نہیں۔ بلکہ ہر تعلیم یافتہ شہری کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی فکر کی صلاحیتوں سے تقریر و تحریر کے ذریعہ ملک کو مستفید کرتا رہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض اوقات پکارنے والوں کی آواز بیٹھ جاتی ہے۔ مگر اکثر ان کا گلا دبا دیا جاتا ہے تاکہ پھر آواز ہی نہ نکلے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ وہی جرائم جن سے معمولی آدمی سزا کے مستوجب ہوتے ہیں اعلیٰ عہدیداروں میں پہونچکر جرائم نہیں رہتے بلکہ مصلحت، تدبر، سیاست اور حکمت عملی کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج مصنوعی تدبر، بناوٹی اخلاق اور نمائشی سیاست کا ہنگام نہیں۔ مناسب ہوگا کہ ریا پیشہ زندگیوں کے حجاب الٹ دیئے جائیں ورنہ حقیقت پسند نگاہیں انکو چاک چاک کر دینگی۔

مذہب

جس کی ہر انسان ایک جداگانہ تعریف کرے اور اپنے ماحول کے مشاہدے وتجربہ سے کبھی اسکو منفعت بخش اور کبھی اس کو مضرت رسان تبلائے۔ کلیسا اور شہنشاہیت کی پیکاریں اقوام مغرب کو ان کے اپنے ماحول نے اس امر پر مجبور کردیا کہ تصور مذہب سے وہ اپنی فکر کو آزاد کریں اور اس پیکار کے علاوہ مادہ پرستی۔ زندگی کا میکانکی ہوجانا۔ معاشرتی انقلاب اور سب سے زیادہ سوویٹ اشتراکیت کی اشاعت دہریت نے مذہب کے خلاف صف آرائی کی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سائنس کے جدید تصورات نے مذہبی فکر کی اعانت اور جوہر کی شکست وریخت اور اس مشاہدہ وتجربہ کے بعد تو ساری کائنات کو ایک ریاضی دان دماغ کا نتیجہ اور ایک منضبط قانون کا پابند سمجھنا پڑا۔ آج جیسے جیسے سائنسی افکار میں اضافہ ہورہا ہے نظام عالم ہرآن کسی قدرت اعلیٰ کے منشار کے زیر اثر نظر آرہا ہے۔

چونکہ مذہب انسان کی ساری زندگی پر محیط ہے اور اس کے لطیف ترین احساسات اور جذبات کے لئے تشفی بخش ہے اس لئے وہ حکومتیں بھی جو دہریت سے زیادہ دور نہیں مذہب کا لبادہ اوڑھ کر اور اپنے کو حامئ مذہب بتلاکر اپنے استحکام وبقا کا سامان کررہی ہیں درآنحالیکہ مذہب نے کبھی کسی حکومت کے بقاء کی ذمہ داری نہیں لی ہے۔

گذشتہ دو صدیوں سے اقوام مشرق نے مغربی افکار کو اپنا قبلۂ نگاہ بنا رکھا تھا اور یورپ کے ہر مکتب خیال کے بغیر سوچے سمجھے تقلید شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خداوندان یورپ نے مادیت کے زور میں جب مذہب کو ٹھکرا دیا تو غلاموں نے بھی مذہب سے بے رُخی برتی اور اس بے اعتنائی کو عقل و دانش کا آخری فیصلہ سمجھ بیٹھے یہ کبھی غور نہیں کیا کہ دو سو سال قبل یورپ میں مذہب عیسوی کا پرچار اس انداز پر کیا جا رہا تھا کہ ایک طرف دین مسیح کے پیروؤں کو رہبانیت کی تلقین اور جدید سائینس سے الگ رہنے کی تعلیم دی جا رہی تھی تو دوسری طرف حکومت سے پاپائے وقت اقتدار چھیننے کی فکر میں تھا۔ اور ادھر نظام جاگیرداری اور شخصی حکومتوں کے روز افزوں مظالم سے پست اور متوسط انسان تڑپ اُٹھے تھے جس کا لازمی نتیجہ ایک ایسے فلسفہ کی تخلیق تھی جو مذہب کو افیون اور ذاتی ملکیت کو غداری قرار دے۔ اس طرح کے مفکر اپنے ماحول سے متاثر تھے اور یہی وہ وقت ہو سکتا تھا جبکہ مفلس و شکستہ حال کسان و مزدور اور آفت رسیدہ و پریشان روزگار درمیانی طبقہ ہر ایسے ضابطۂ حیات کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاتا اور انقلاب پر مائل ہوتا جو اس کے لئے ذرا سا بھی سکون بخش ہو۔ لیکن یہ فکر کی تباہ کن غلطی ہوگی اگر دقت اور ضرورت کو نظر انداز کر کے ساری دنیا کے لئے ایک ایسے فلسفہ کی ترویج کو لازمی قرار دیا جائے جو ایک مکمل دستور حیات کی موجودگی میں بے ضروری اور ناقابل قبول ہو۔

"

آئیے اس فلسفۂ اشتمالیت اور اشتراکیت کی روشنی میں ایک سوال بند پر غور کریں۔

(۱) کیا آج ساری دنیا کے انسان کسی ایک نظریۂ حکومت کو قبول کر سکتے ہیں؟

(۲) روئے زمین کے طبعی و جغرافی اختلافات کے باوجود کیا نسل و رنگ اور امیال و عواطف کا فرق مٹ سکتا ہے؟

(۳) دو اور ب انسانوں کی تعلیم کیا اس نہج پر ہو سکتی ہے کہ ہر انسان مطمئن ہو جائے اور کوئی اپنے کو محکوم نہ سمجھے؟

(۴) کیا دنیا کا ہر انسان ساری صنعتوں سے یکساں مستفید ہو سکے گا تاکہ کسی کو کسی پر تفوق نہ رہے۔

(۵) اور کیا فلسفہ منطق جمالیات اور دوسرے ایسے ہی علوم کی تحصیل جن سے رُوح کی تسلی کا سامان ہوتا ہے قطعی طور پر روک دیئے جائیں گے کیونکہ یہ باقی رہیں تو پھر علمی تفوق پیدا ہو جائیگا؟

(۶) فطرت انسانی کے عمیق مطالعہ کے بعد کیا اب بھی انسانوں کے اختلاف کو اختلافِ مذاہب پر محمول کیا جائیگا؟

(۷) کیا مذہب کو ختم کر دینے کے بعد دنیا میں ہگل اور مارکس پھر نہیں پیدا ہوں گے کہ جن کے متصادم نظریات پر شدید اختلاف ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا؟

(۸) کیا اس کے بعد دنیا میں سارے انسان ایک ہی طرح سونچینگے اور فکر کا تفوق بھی باقی نہ رہے گا؟

(۹) کیا نوامیس قدرت کا عملِ ارتقاء ساری دنیا کے انسانوں کے لئے یکساں ہوگا؟

(۱۰) کیا انسانی عقل کی قوت تخلیق کو معطل کر دیا جائیگا؟

اس سوال بندی پر غور و فکر کے بعد کیا کوئی ایسا حل پیش کیا جا سکتا ہے کہ انسانی فطرت کے اصول بھی نہ بدلنے پائیں اور بغیر کسی خونین انقلاب کے دنیا صلح و آشتی امن و چین سے قریب تر ہو جائے۔

طبقہ واری جنگ یقیناً ہمیشہ سے ہے اور کوئی فلسفہ اسکو ختم نہیں کر سکتا اس لئے یہ ہمیشہ رہیگی۔ صرف طبقہ یا کلاس کے معنیٰ بدلتے جائیں گے۔ لیکن کیا اس کا امکان ہے کہ انسانوں کے سارے طبقات مذہب کے ہٹتے ہی یک لخت ختم ہو جائیں گے؟ یا یہ ممکن ہے کہ ایک اعلیٰ ضابطۂ حیات اگر حکومت کے قوانین کی جگہ لے اور حکومتیں اس ضابطۂ حیات کی اپنی اپنی رعایا سے تعمیل کروائیں تو طبقات کے باقی رہنے کے باوجود کشمکش کے ختم ہو جانے کی بہت زیادہ توقع ہے۔

جس ضابطۂ حیات کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا وہ فطرت انسانی کے غائر مطالعہ کے بعد ایک ایسے مکمل قانون سے عبارت ہے جسکی بنیادیں مکارم اخلاق پر رکھی گئی ہیں۔ اور جس کی پابندی طوعاً و کرہاً انسان کو بہتر سے بہتر

بنا سکتی ہے۔ یہی وہ دستور العمل ہے جس نے طبقات کو باقی رکھکر آپس میں اُخوت کا حکم دیا۔ انسانی فطرت خلقت ہی کے اعتبار سے متفاوت ہے۔ جس کو کبھی احساس برتری پریشاں کرتا ہے اور کبھی جبلت اکتساب۔ انسان اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے کیلئے اجتماع چاہتے ہیں لیکن کبھی وہ برداشت نہیں کر سکتے کہ جامع انسانیت میں انکی فرد گم ہو کر رہ جائے۔ انکا شوق تعمیر، انکا ذوق جستجو باہمی مسابقت کی خواہش غلبہ و اقتدار کی تمنا۔ غرض اُنکا انا ایک ظہور چاہتا ہے جس کو وقتی طور پر کچھ عرصہ کے لئے جبر و استبداد سے کوئی نظام حکومت دبا تو سکتا ہے فنا نہیں کر سکتا۔ لیکن مکمل ضابطۂ حیات وہی ہوگا جو انا کی پرورش اس طرح سے کرے کہ وہ اُبھرتے ہوئے دوسرے اَنا کو نقصان نہ پہونچائے ہم یہی چاہتے ہیں کہ آج کم از کم اسلامی حکومتیں ہی اس ضابطۂ حیات پہ پابند ہو کر ایک طرف تو اپنی حکومتوں میں ہم آہنگی پیدا کریں اور دوسری طرف نوعِ انسانی کو "صراط مستقیم" کی ہدایت کریں۔ سیاسی اعتبار سے دوسرے ممالک کے لئے کتنی قابل تقلید یہ مثال ہوگی اگر روئے زمین پر جہاں جہاں مسلم ریاستیں ہیں وہاں ایک ہی قانون، ایک ہی قسم کی سزا، ایک ہی طرز کی قومی تعلیم ہو غرض عدلیہ و مُقننہ اور عاملہ ایک ہی اساس پہ اگر کام کریں اور خصوصاً جبکہ یہ اساس مکمل موجود ہوں اور باہر سے جنکو حاصل کرنیکی ضرورت نہ پڑے۔

ہم ایسے مُسلم امپائر کو نوع انسان کی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔

وہ

وہی جسکو راحت میں نہیں تکلیف میں پکارا جاتا ہے جسکو مست انگڑائیوں میں نہیں نزع کے جھٹکوں میں یاد کیا کرتے ہیں۔ آخر اسکو متمدن دنیا کیوں بھلا رہی ہے؟ اسکے قانون نے سائینس کی مخالفت کب کی؟ وہ قانون انسانی ترقی کا کب مانع رہا؟ اُس کے نام لیوا علمبرداروں نے بے راہ روی اختیار کی تو اُس سے کیوں دشمنی؟ اس کا نام لیکر اگر مذہب کے مُبلغّین اور زیادہ شبہات پیدا کردیں تو کیا عقل والوں کو اِس کا یقین ہوگیا کہ وہ بھی اُن سے راضی ہے۔

اُسکو دلوں سے ہٹا کر روٹی کے مسئلہ کا حل نکالنا گویا اپنی خدائی کو منوانا ہے۔ اس کے خوف کو دل سے دور کرکے اپنی حکومت کا خوف بٹھانا اسی لئے ہے کہ حکمران سب کو اپنے پاس ذمہ دار بنا کر خود اپنے کو کسی کے پاس ذمہ دار نہیں بنانا چاہتا۔

تصوّرِ آزادی کی یہ حدیں لرز رہی ہیں کہ اپنے جبر و استبداد پر کوئی نگران نہو۔ فتنہ۔ تباہی۔ جنگ۔ انسان کشی یہ سب اس وقت ہے جب انسان حکومت پر آکر یہ بھلا دے کہ کوئی اور طاقت اس کے مافوق ہے۔ اور اپنی خدائی کو منوانے کیلئے ساری انسانیت کو اپنے حرص کے شعلوں میں جھونک دے۔

ترقی کرتی ہوئی حکومتیں شوق سے انسان کی مصیبتوں کو دور کرنے کے لئے راستے نکالیں مگر خدا کے تصور سے کیوں یہ دشمنی کہ بنیاد میں کسی اصلاح کی خدا نہو۔

نیٹشے نے کہا تھا کہ جرمن قوم کا خدا مر گیا۔ ہاں جو اس قوم پر خدائی کرنا چاہتا تھا وہ تو مر گیا مگر اس نے مرتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے یہ آواز سُنی کہ "ہم دیکھ رہے ہیں"۔

کاش دنیا پھر ایک بار ٹھنڈے دل سے سوچے کہ خدا کا تصور اور اس پر ایقان سیاست کے لئے بھی کتنا ضروری ہے۔

یہی ایقان آپس کی اُخوت کو مضبوط کرتا ہے۔ غریب اور امیر مُفلس اور تونگر کے درمیان رابطہ بنتا ہے۔ حکمرانوں کو ظالم نہیں بننے دیتا۔ حکومت کے قوانین وہیں تک رہتے ہیں جہاں کسی کی نظر پڑے۔ وہ انسانوں کو خیر پر قائم نہیں رکھ سکتے لیکن یہ ایقان تنہائیوں میں بھی قانونِ حق کی پابندی کرواتا ہے اسی غیر مرئی ذات سے محبت و خوف انسانیت کے لئے کمینہ پن سے نجات کا باعث ہے جس سے قومی کردار بلند ہوتا ہے۔ یہیں سکونِ خاطر اور اطمینانِ قلب ملتا ہے۔ پھر کیوں اُس سے بیزاری؟

حکومتوں کے جدید نظریات یہ چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کو خدا کا نام بھی یاد نہ رہے تعلیم اس نہج کی ہو کہ بچے کبھی اس نام سے مانوس ہی نہ ہوں یعنی دنیا انسان کو اس کی فطرت سے علیحدہ کر دینا چاہتی ہے یہ نہ سوچا کہ اس طرح آنے والی نسلوں میں تنگ نگاہی اور خود ستائی کا جہل مرکب پیدا ہوگا۔ یہی خدا کا تصور ہے کہ مشرق و مغرب کے انسانوں کو ایک مالک کا مملوک بنا کر ہمدردی کے

جذبات کو اُبھارتا ہے اور مغرب کی تباہی کو مشرق کا انسان اپنی تباہی سمجھتا ہے۔
صحیح معنی میں آج کی حکومتیں اس خُدا دشمن طرز تعلیم سے ایسی نسل پیدا کرنا چاہتی ہیں جو نفس پرست ہو اور اسکو اپنے سوا کسی اور کا خیال نہو۔ یہ سب اسی لئے کہ اس مالک کا لشکر اُس کا قہر اس کا عذاب اُس کے خزانے اُس کی شان و شوکت ظاہری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔ اور ظاہر پر مرنے والے یہ سوچتے ہیں کہ اگر ایسی ہی اس حکومت کی شان ہوتی تو اس کے پیغامبر صاحب تخت و تاج بنے رہتے الٰہی حکومتیں لے کر آتے۔ مگر کسی کو کیا خبر کہ یہ دنیا اس وقت جبری اور قہری طور پر ایمان لاتی۔ اخلاص و ریا میں امتیاز نہ رہتا۔
اخلاص کردار کی بلندی ہے اور جبر سے کام غلامانہ ذہنیت ہے اور قانون جبر سے کام لیتا ہے۔ انسان جسم و روح کی ترکیب ہے یہ ہوا جب مٹی کو لے کر اُڑتی ہے تو انسان بلند ہوتا ہے۔ روح کو اُس کی منزل سے موڑنے کی کوشش جسم کی تباہی ہے۔
اِس دنیا کا سرمایہ ایک اضافت ہے اور وہ بھی عارضی اضافت ایک قانونی تصور اور اس کے سوا کچھ نہیں جس کا ہمیشہ جسم سے تعلق رہتا ہے اِسی جسم کے لئے درست ہو یا غلط سرمایہ کی برابر تقسیم اور تمام انسانوں کی یکساں راحت کا تصور پیدا ہوا۔ لیکن اس نے لئے روح کو اس کی لذتوں سے محروم کر دینا کون سا فلسفہ ہے؟ اکلوتے بیٹے کی موت پر جب بیوہ ماں کی دنیا تاریک ہو جاتی ہے تو

اس کے نفس کی خاموش حرکت میں کس کی یاد سکون بن جاتی ہے؟ طوفان خیز سمندر میں ڈوبتے ہوئے جہاز کے مسافر کس کے مبہم ذکر سے ایک تسلی سی محسوس کرتے ہیں؟۔ اور اسی طرح جب تمام دنیوی رشتے ٹوٹنے لگتے ہیں تو ہر بے آسرا انسان کے لئے اینٹھتی ہوئی رگوں اور ڈوبتی ہوئی نبضوں میں کونسا آسرا دکھائی دیتا ہے؟ مگر تقسیم زر کی طرف مائل دُنیا اُس آسرے کو بھی چھین لینا چاہتی ہے جو بظاہر روح سے متعلق ہے۔ لیکن آگے چل کر مبہم عمل اور مسلسل صداقت سے جسمانی لذت بھی بن جاتا ہے۔

انسانیت میں جب تک کائنات کے لئے احساس جمال، احساس توازن اور احساس رحمت باقی ہے خدا کا تصور بھی عقلاً باقی ہے اور اس کے آگے چونکہ انسانی زندگی تمامتر فکر و تعقل کے نتائج کی پابند نہیں اور اس کے بعض افعال ارادی نہیں ہوتے اس لئے عقل کے اِدھر جذبات اثر پذیری و وجدان انسان کو اس ہستی کی طرف کھینچتے ہیں۔ جو لفظوں میں مقید نہیں۔ وہ وہ ہے ایک نارسا اشارہ۔ جو معنی کے اعتبار سے بعید از فہم مگر دل کی صلاحیتِ معرفت سے لبریز خزانہ ایک غیر محدود مدعا جو بظاہر مختصر لیکن جس سے لاتُعد تمنائیں وابستہ اور لاتُحصیٰ دعائیں لپٹی ہوئی ہیں۔

وہ۔ کتنا لذت سے بھرا ہوا لفظ ہے جو خود ایک کلمہ بنتا ہے اور ہر متکلم پر طوعاً و کرہاً کبھی نہ کبھی طاری ہو جاتا ہے۔ دنیا مانے یا نہ مانے۔ وہ

وہ حقیقت ہے جو استدلال سے بلند اور فلسفہ و منطق کی سعی غیر مشکور سے آزاد ہے۔

وہ ہُو جس کو ایک عالم غائب سمجھ کر گمراہ ہے مگر جو نفس انسانی کے تزکیہ کے بعد اَنْتَ سے مُراد ہے اور اَنا کے رگِ گلُو سے زیادہ قریب۔ لیکن وہ ان سب کے باوجود وہ (ھُو) ہے۔

انتہا

موت ایک حقیقت ہے جو ہر انسان کی سوانح حیات کا حرفِ آخر ہے جس کو نہ کوئی سیاست ٹال سکتی ہے نہ حکمت۔ حیلہ جو بھی ہو اور طریقہ کچھ بھی ہو انسان مادّی حرارت و حرکت کو تو کھو دیتا ہے۔ وقت کی زد سے کٹ جاتا ہے اور اسکے ساتھ ہی اُس کی دنیا بھی۔

انسان کو صرف انسان ہی پر ہنسی آتی ہے اور اُسی کے تعلق سے رنج و غم کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ مسرت و غم اور محبت و نفرت کے جذبات باہمی ربط سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی ربط کے سبب اس زندگی کو کسی قوم کی مکتوبی تاریخ محفوظ کر لیتی ہے جو اپنی افادیت کے اعتبار سے اجتماعی زندگی کے لئے اہم رہی ہو۔ وہ ادب کی تاریخ ہو یا فلسفہ کی۔ تاریخ طب ہو یا تاریخ سیاست، اپنے افادی تعلق سے کسی انسان کی زندگی کی تفصیل بھی قلمبند کی جاتی ہے اور موت کی بھی۔

کامیاب جینے پر کامیاب مرنا منحصر ہے اور کامیابی صرف سکون و راحت سے نہیں بلکہ اکثر اضطراب و کشمکش سے عبارت رہی ہے۔ جینے کے صحیح ترین اُصول کا تعین اور اس پر مسلسل عمل سب سے بڑی کامیابی ہے۔

مرنا سب کو آتا ہے سکھلایا نہیں جاتا۔ جینا سب کو نہیں آتا سیکھنے اور سکھلانے کی

ضرورت ہوتی ہے۔

دنیا کے بڑے صاحب عزم انسانوں نے اپنی نوع کو جینے کے طریقے تبلائے ہیں اور ہمیشہ اُس کو اچھی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی ہے لیکن متاثر ہونیوالے دماغ مختلف ہو کر سوچتے ہیں اس لئے تمدن و تہذیب کی راہیں بھی راہ مستقیم سے کٹتی چلیں۔ یہانتک کہ آج یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ اب کس کے اشاروں پہ جئیں۔

انسان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اسکی اپنی زندگی کی تشکیل ہے تاکہ وہ معاشرہ کا رکن ہونے کی حیثیت سے اپنی اور اپنی قوم کی اصلاح کر سکے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان معاشرے سے کٹ کر جی نہیں سکتا۔ اس کی عادتیں اور اسکی خصوصیات تمامتر اجتماعی زندگی کے اثرات سے پیدا ہوتی ہیں۔ انہی خصوصیات سے کردار اور سیرت کی تعمیر ہوتی ہے۔

جینا ایک مسلسل عمل ہے اس عمل کے تین اہم عناصر ہیں ادراک، جذبہ اور فعل۔ یہ قوتِ عمل صحت، تندرستی اور جسمانی طاقت چاہتی ہے تاکہ کارکردگی کی صلاحیت پیدا ہو۔

جسمانی صحت کیساتھ ایک اعلیٰ زندگی کی تشکیل کے لئے جُراءت لازمی ہے وہ جُراءت جو ہر خوف پر غالب آئے۔ وہ جراءت جو کسی کی مُروّت و خوشامد سے ہٹ کر قیام حق کے لئے تیار ہو جائے اور وہ جراءت جس سے خود انسان اپنی غلطیوں کا بڑی خندہ پیشانی سے اعتراف کرے اور اسکی اصلاح کی طرف مائل ہو۔

اجتماعی زندگی کی ارتقا کے لئے انسان کی قوتِ عمل کے ساتھ ساتھ ذہانت حالات سے واقفیت اور عقل سلیم کی ضرورت ہے تاکہ فیصلہ میں قوت آئے اور انسان اپنی قوت اجتہاد سے کام لے۔ لیکن فیصلہ کی طاقت کے لئے انسان کا ذکی الحس ہونا ضروری ہے تاکہ وہ دوسروں کے درد سے فوری متاثر ہو سکے۔

یہی اجتماعی احساس جذبات میں جوش و حرارت پیدا کرتا ہے جس سے عمل میں حرکت پیدا ہوتی ہے پھر یہی حرکتِ عمل اپنی قوم کی حیات بن جاتی ہے۔

یہی جینے کے وہ اصول ہیں کہ جس سے انسان جو تنہا کبھی نہیں جی سکتا خود بھی جیتا ہے اور اپنی قوم کو بھی جلاتا ہے۔

نبضوں کی حرکت اور نفس کی مسلسل آمد و شد کے باوجود نفیِ حیات کا فلسفہ۔ دنیا میں رہتے ہوئے اور اُسکی ہر نعمت سے استفادہ کرتے ہوئے ترکِ دنیا کی کوشش۔ خدا پرستی سے ہٹ کر مقدر پرستی کی عادت انسانی زندگی کو تباہ کر دیتی ہے اور ایسا انسان نہ ملک کا محافظ بن سکتا ہے نہ معمار۔

اَنفُس و آفاق میں ایک ربط ہے جس کو پہچاننے اور اس سے استفادہ کرنے کے لئے بصیرت چاہیئے۔

دنیا مشاہدہ کی دعوت دے رہی ہے اس زمین پر انسان کی تاریخ عبرتوں کا ذخیرہ ہے ہر انسان کے لئے اُس کا اپنا ایک

منصبِ حیات ہے۔ اُس کی تکمیل کے لئے کامل اخلاص کے ساتھ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ ایمان اور عمل صالح۔ حق اور صبر کا توصیہ قومی تعمیر کے عناصر ہیں اور یہی عناصر نوع انسان کی نجات کے ضامن ہیں۔

امکان بھر سعی اور اللہ پر بھروسہ مردِ عمل کا کردار ہے۔

حسبی اللہ ونعم الوکیل ونعم المولیٰ ونعم النصیر

یہاں پہونچ کر سلسلۂ افکار ٹوٹ گیا۔ اس مختصر سے مجموعہ میں اہل فکر کے لئے بہت کچھ ہے۔ عملی سیاسیات پر تفصیلی غور و خوض کے لئے اگرچہ بہت سی کتابیں ہیں لیکن عام استفادہ کے لئے میں دو کتابوں کی سفارش کرونگا۔ اصول تعلیم۔ مولوی خواجہ غلام السیدین۔ تاریخ فلسفۂ سیاسیات مولوی محمد مجیب۔ مجھے دونوں سے مدد ملی ہے۔ میں ان مصنفین کا شکر گذار ہوں۔

۱۱ ذی قعدہ ۱۳۶۶ھ

رشید ترابی
حیدر آباد دکن